www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسلامی تحریک
درپیش چیلنج

پروفیسر خورشید احمد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی تحریک: درپیش چیلنج

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسلامی تحریک درپیش چیلنج

پروفیسر خورشید احمد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔ اسلام آباد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول دسمبر ۱۹۹۴ء
طبع دوم مئی ۱۹۹۵ء

286
ج و د - ا

کتاب: اسلامی تحریک: درپیش چیلنج
مصنف: پروفیسر خورشید احمد

اہتمام: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز
بلاک ۱۹، مرکز ایف سیون اسلام آباد
فون: ۸۱۸۲۳۰ فیکس: ۸۲۴۷۰۴

طابع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

تقسیم کنندہ: بک پروموٹرز، جناح سپر مارکیٹ
مرکز ایف سیون، اسلام آباد

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹۔۔۔ جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر 15813

قیمت: ۴۰ روپے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مندرجات

آغاز ۷

حصہ اول

نیو ورلڈ آرڈر کا چیلنج اور اسلام

- مسلم دنیا: کل اور آج ۱۲
- بنیاد پرستی کا ہوّا ۱۵
- مغرب کے دوہرے معیار اور اسلام ۱۶
- اسلام اور جمہوریت ۱۹
- اسلامی احیاء اور نیو ورلڈ آرڈر ۲۱

حصہ دوم

اسلامی احیاء، بنیاد پرستی اور اسلامی تحریک

- بنیاد پرستی اور اسلامی تحریک ۳۱
- مسلم سوسائٹی کا انحطاط اور اسلامی تحریک ۳۴

www.iqbalkalmati.blogspot.com

- ایران اور اسلامی انقلاب ۳۸
- تحریک پاکستان اور پاکستان کا نظریاتی بحران ۴۲
- جنگ خلیج اور اسلامی تحریکیں ۴۶
- سود کا چیلنج اور اسلامی تحریک ۵۵
- پرائیوٹائزیشن اور اسلامی معاشی حل ۵۸
- علامہ اقبال اور قائداعظم کا تصور پاکستان اور تحریک اسلامی ۶۱
- اقبال کا تصور اجتہاد اور تحریک اسلامی ۶۶
- کیا قائداعظم سیکولر پاکستان کے داعی تھے؟ ۷۰
- عورت کی سربراہی اور اسلامی تحریکیں ۷۳
- بھارت میں ہندو انتہا پسندی کا احیاء اور تحریک اسلامی ۷۹

حصہ سوم

- اسلامی تحریک کی قوت ۸۷

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغاز

"اسلامی تحریک - درپیش چیلنج" ایک نسبتاً مختلف نوعیت کی تالیف ہے۔ اس میں چند ان بنیادی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے، جو آج کی دنیا میں اسلامی تحریک اور اسلامی احیاء کے ناتے سے بحث کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔

- پہلا مضمون "اسلام اور نیا عالمی نظام" میرے اس مقالے کا ترجمہ ہے جو امریکہ کے ایک علمی مجلے میں ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں مغربی دنیا کو مخاطب کر کے امریکہ کے مجوزہ عالمی نظام پر مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے تنقید و احتساب کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کا اصل ہدف اور اسلامی تحریکات کا حقیقی پروگرام کیا ہے۔
- اس مجموعہ کا دوسرا حصہ اس تفصیلی انٹرویو پر مشتمل ہے جو "اسلامی احیاء، بنیادی پرستی اور اسلامی تحریک" کے عنوان سے دیا جا رہا ہے۔ یہ انٹرویو دراصل روزنامہ "نوائے وقت" کے لیے جناب عطاء الرحمٰن نے دو طویل نشستوں میں لیا اور جس کو سلیم منصور خالد نے مرتب کیا۔ یہ انٹرویو مجلہ "آئین" لاہور (مدیر: مظفر بیگ) دسمبر ۱۹۹۳ء کے شمارے میں شائع ہوا، بعد ازاں روزنامہ "جسارت" کراچی نے اسے سلسلہ وار شائع کیا۔ موجودہ شکل میں مرتب کرتے وقت میں نے اس انٹرویو میں چند غلطیوں کی اصلاح کرنے کے علاوہ چند مقامات پر مختصر حوالوں کے ساتھ معمولی اضافے بھی کیے ہیں۔
- تیسرا مضمون "اسلامی تحریک کی قوت" دراصل ایک سوالنامے کے جوابات ہیں۔ یہ سوالات برادرم (ڈاکٹر) ممتاز احمد نے ہفت روزہ "آئین" لاہور ["تربیت نمبر" ۱۷ اگست ۱۹۶۵ء] کے لیے لکھ کر دیئے تھے۔ وہیں سے یہ سوال و جواب پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں، دوسری اجتماعی تحریکوں کے مدمقابل اسلامی تحریک کی اس امتیازی قوت پر مختصر بحث کی گئی ہے، جس کا مدار سیرت و کردار ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنی موجودہ شکل میں یہ مجموعہ ان شاء اللہ بہت سے سوالوں کے جواب تلاش کرنے میں معاون ہوگا، جنہیں مغرب کی نظریاتی یلغار نے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا کر دیا ہے۔

اس موقع پر میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز میں اپنے رفقائے کار کا ممنون ہوں، جنہوں نے اس تالیف و ترتیب میں معاونت کی۔ انگریزی مضمون کا ترجمہ برادرم سہاول خان نے کیا اور جس پر نظر ثانی برادرم ڈاکٹر سفیر اختر (مدیر: "عالم اسلام اور عیسائیت") نے کی ہے۔ برادرم خالد رحمن اور برادرم سلیم منصور خالد نے کتاب کی تیاری اور نظر ثانی میں مدد فرمائی ہے۔ شعبہ کمپیوٹر نے اسے کتابت کے دشوار عمل سے بے نیاز کیا اور اب یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اگر آج کے عالمی حالات اور تہذیبی اور سیاسی چیلنج کے پس منظر میں اس مجموعہ سے اسلامی تحریک کے موقف کو سمجھنے میں قارئین کو کچھ مدد ملے تو یہ میرے لیے باعث سعادت ہوگا۔

خورشید احمد

۱۷ دسمبر ۱۹۹۴ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصہ اول

نیو ورلڈ آرڈر کا چیلنج اور اسلام

دنیا بھر کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے لیے "نیو ورلڈ آرڈر" (نیا عالمی نظام) جنم لینے سے پہلے ہی ختم ہو چکا ہے*۔ بیسویں صدی نے بہت سے رہنماؤں کو ایک نئے عالمی نظام کے بارے میں باتیں کرتے دیکھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکی صدر وڈرو ولسن نے مستقبل کے عالمی نظام کے موضوع پر مباحثے میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا جس میں کچھ اصولوں اور تسلیم شدہ آفاقی قدروں کی حکمرانی کا تصور تھا۔ یہ خواب "مجلس اقوام" (لیگ آف نیشنز) کی ناقص ساخت اور اس کے فوری خاتمے کے ساتھ بکھر گیا۔ دنیا نہ ایک نئی جنگ سے بچ سکی اور نہ جمہوریت ہی محفوظ رہی بلکہ دنیا "دائیں" اور "بائیں" بازو کی کلیت پسندی کے نرغے میں گھر گئی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایک بار پھر نئی امیدیں پروان چڑھنے لگیں۔ اقوام متحدہ کی بنیاد رکھی گئی اور ایک نئے عہد کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ مگر بہت جلد یہ امیدیں بھی خاک میں مل گئیں اور نسلِ انسانی تباہ کن سرد جنگ کے دور میں داخل ہو گئی جو چار دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔

۱

حالیہ برسوں میں "نئے عالمی نظام" کی تلاش میں تیزی آئی ہے۔ سرد جنگ کے مفروضہ اختتام پر سابق امریکی صدر جارج بش نے ۱۹۹۰ء کے آغاز میں ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت پر زور دیا۔ کویت پر عراقی حملے اور امریکہ کی سرکردگی میں لڑی گئی خلیجی جنگ کو نئے عالمی نظام کا ابتدائیہ قرار دیا گیا۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ "مستقبل میں کوئی جارح اپنے کیے کی سزا پائے بغیر نہ

* یہ مضمون امریکہ سے شائع ہونے والے مجلے مڈل ایسٹ افیئرز جرنل (شمارہ ۳ جلد ۴ ۱۹۹۳ء) میں شائع ہوا بعد ازاں اس کا اُردو ترجمہ "عالم اسلام اور عیسائیت" [فروری ۱۹۹۳ء] انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں شائع ہوا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے گا" اور "طاقت کے بل بوتے پر کسی کا قبضہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔ مزید کہا گیا کہ "بین الاقوامی سرحدوں میں یک طرفہ طور پر ردوبدل کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ سب کو انسانی حقوق کی پابندی کرنا پڑے گی"، اور "یہ امر بھی یقینی بنایا جائے گا کہ قومی سرحدوں کی پروا کیے بغیر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا خاتمہ ہو سکے"، اور "اقوام متحدہ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے ایک نیا کردار ادا کرے گی۔" ان اصولوں کے تعین کے ساتھ یہ باور کر لیا گیا کہ اب نسلِ انسانی جمہوریت اور سلامتی کے ایک نئے دور میں داخل ہو جائے گی۔

ان اعلیٰ مقاصد کے ساتھ کسے اتفاق نہیں ہوگا؟ تاہم سوال یہ ہے کہ وہ قومیں جو آج کی دنیا میں سیاسی لحاظ سے طاقتور ہیں، کیا وہ ان مقاصد کے سلسلے میں سنجیدہ ہیں یا وہ محض اپنے مخصوص سامراجی مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے ان نعروں کو استعمال کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں؟ یہ انتہائی بنیادی اور اہم سوال ہے۔

۲

مسلم دنیا —— کل اور آج

آج مسلمان دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ دنیا بھر میں ان کی تعداد تقریباً ایک ارب ۲۰ کروڑ ہے۔ ۵۳ آزاد مسلم مملکتوں میں ۸۰ کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ یہ مسلم مملکتیں دنیا کے ۲۳ فیصد رقبے پر محیط ہیں۔ اگرچہ مسلم آبادی مشرقی اور وسطی یورپ میں بھی ہے، تاہم البانیہ میں مسلمانوں کی تعداد ۷۳ فیصد ہے۔ جبکہ بوسنیا ہرزے گووینا میں یہ قابلِ لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ دنیا کے دیگر حصوں میں بھی مسلمان بھاری تعداد میں آباد ہیں، بالخصوص یورپ اور امریکہ میں، جہاں اسلام، عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب ہے۔

تاہم اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے بارے میں مغرب میں سب سے زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک ایسا مذہب جو امن اور انصاف کا علمبردار ہے، اسے جنگ اور جنونیت کے مذہب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہزار سال سے زائد کے عرصے میں مسلمان دنیا میں نہ صرف ایک غالب قوت رہے ہیں، بلکہ اسلامی تہذیب اور معاشرے نے غیر مسلموں سمیت سب کو امن اور تحفظ فراہم کیا۔ حقیقت میں یہ مسلم دنیا ہی تھی جو ان تمام لوگوں کے لیے پناہ گاہ اور جائے امان رہی، جنہیں دنیا کے مختلف حصوں، بالخصوص

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یورپ میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

رابرٹ بریفالٹ، مسلم ریاست اور معاشرے، جو بڑی حد تک اسلام پر مبنی تھے، اس کے ریکارڈ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مشرق میں تھیاکریسی فکری لحاظ سے ظالم اور جابر نہیں تھی۔ ہم وہاں ابہام اور جمود، سوچ پر پابندی اور فکری اختلاف کے خلاف مسلسل جنگ کا وجود نہیں پاتے، جو یورپی دنیا کی معروف خصوصیت ہے اور جسے یونان اور روم کی پشت پناہی حاصل تھی[1]۔

تاریخ دان میور (Muir) واضح الفاظ میں رقم طراز ہے کہ:

> مفتوحین کے ساتھ [مسلمانوں کی] نرم روی، ان کا انصاف اور دیانتداری، رومنوں کے ظلم و تشدد اور عدم رواداری کے مقابلے میں ایک متضاد تصویر پیش کرتی ہے۔ شامی عیسائیوں کو عرب فاتحین کے تحت اس سے کہیں زیادہ شہری آزادی حاصل تھی، جتنی انہیں ہرکولیس کے اقتدار میں حاصل تھی، اور انہیں اپنی سابقہ حالت میں لوٹ جانے کی کوئی خواہش نہیں تھی"[2]۔

یہ ہے انسانی تاریخ میں مسلمانوں کا ریکارڈ۔

گزشتہ تین صدیوں کے دوران میں صورت حال میں ٹھوس تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس عرصے میں مغربی استعماری طاقتیں دنیا پر حکمران رہی ہیں اور مسلم دنیا بحیثیت مجموعی مغربی ملکوں کے زیرِ تسلط رہی ہے۔ اس دور میں تیسری دنیا کی اقوام اور عوام کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص استعماری طاقتوں کے ہاتھوں کئی انداز میں نقصان اٹھانا پڑا۔ مشہور مؤرخ اور فلسفی آرنلڈ ٹائن بی نے مغرب کے ساتھ دنیا کے تعلقات پر بڑی خوبصورتی کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

> دنیا اور مغرب کے درمیان تعلقات میں، جو گزشتہ چار پانچ سو سال سے چلے آرہے ہیں، مغرب نہیں بلکہ دنیا ہی اب تک وہ فریق ہے جسے سخت تجربے سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ مغرب نہیں، جس پر دنیا کی ضرب پڑی ہے، بلکہ یہ دنیا ہے جسے مغرب کی چوٹ برداشت کرنی پڑی ہے اور یہ چوٹ بہت سخت ہے۔ دنیا کہے گی

---

1. Robert Briffault "*The Making of Humanity*" pp113.
2. Muir "*The Caliphate: Its Rise, Decline and Fall*", p 128.

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ مغرب عصرِ جدید کا سرکردہ جارح ہے اور یقیناً مغرب کے بارے میں دنیا کا یہ فیصلہ گزشتہ چار ساڑھے چار صدیوں کے عرصے کے حوالے سے جو ۱۹۵۰ء میں ختم ہوا، بجا دکھائی دیتا ہے[3]۔

پروفیسر فلپ کے حتی ماضی قریب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں:

بدقسمتی سے، بالخصوص گزشتہ ایک یا دو دہائیوں میں مغرب کے اثرات سب اچھے نہیں رہے۔ مغربی [مسیحی] مشنریوں، اساتذہ اور مبلغین کے انسانیت نواز نظریات اور یورپی و امریکی سیاست دانوں اور جنگ جوؤں کی طرف سے انسانی اقدار کی بے حرمتی کے واقعات کے درمیان ایک واضح تضاد دکھائی دیتا ہے۔ قول و فعل کے درمیان تضاد ہے اور اس عرصے میں اقتصادی اور قوم پرستانہ اقدار پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ گزشتہ دو [عظیم] جنگوں میں ترقی یافتہ اقوام نے جس [انسانیت کش] طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا، اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ مغرب کے انسان میں ان شیطانی قوتوں کو جو اس کی سائنس اور مشینوں نے تیار کی ہیں اور جو اس وقت دنیا کی تباہی کا باعث بن چکی ہیں، استعمال کرنے کی صلاحیت، اور پھر شرق اوسط کے حوالے سے امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دیگر اقوام کا مسئلہ فلسطین کے بارے میں طرزِ عمل، ان تمام باتوں نے مشرق قریب کے اس انسان کو مایوس کرنے میں حصہ لیا ہے، جو مغرب کے ساتھ تعلق استوار کرنے کے لیے کوشاں رہا ہے۔ مغرب کے ان اقدامات سے مشرق کا انسان اس سے برگشتہ ہوا ہے۔ اس کا مغربی انسان کے کردار اور اس کے اخلاق، چاہے وہ نجی ہوں یا معاشرتی، پر ایمان متزلزل ہو گیا ہے[4]۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ مسلم دنیا جو ماضی میں مغرب کے ہاتھوں نقصان اٹھا چکی ہے، اور جو ابھی تک مادی، اقتصادی، تکنیکی اور فوجی لحاظ سے کمزور ہے، اسے مغرب کے لیے ایک خطرے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اپنے تشخص کی بازیافت کے لیے مسلمانوں کی کوششوں اور اُن کی طرف سے اپنے معاملات کو درست کرنے کی مساعی کو مغرب کے لیے ایک چیلنج بتایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ہاں جمہوری عمل کی تقویت اور خود انحصاری کے حصول کے لیے جو بے ضرر سی کوششیں

---

3. Arnold J. Toynbee "*The World and The West*", pp 1-4
4. Phillip K. Hitte "*Islam in The Modern World*"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر رہے ہیں، انہیں "اسلامی بنیاد پرستی" (Islamic Fundamentalism) کے خودساختہ دیو کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے --- امریکہ کے سابق صدور جیسے رچرڈ نکسن (Seize The Moment) اور رونلڈ ریگن (An American Life) سے لے کر فرانسس فکویاما (The End of History and the Last Man) جیسے دانشور اور رچرڈ نف جیسے کالم نگار اور دوسرے بہت سے مغربی دانش ور اسلام کو مغرب کے لیے ایک خطرے کے طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں۔ وہ سب یہی ڈھنڈورہ پیٹ رہے ہیں کہ "اگر کوئی بھوت یورپ اور امریکہ کا پیچھا کر رہا ہے تو وہ اسلامی بنیاد پرستی کا بھوت ہے۔" یہ ایک غیر حقیقی اور یک طرفہ جنگ ہے اور سیاستدان، صحافی اور ذرائع ابلاغ کے لوگ، حتیٰ کہ بعض اہل تحقیق بھی خوف سے بھرپور ایسا منظر نامہ ابھارنے میں ایک فریق بن چکے ہیں۔

لیکن اس سے بڑھ کر سچائی سے بعید کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ یہ بجا ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں اسلام کا احیاء جاری ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اپنے ملکوں میں یا ان سے باہر کسی کے خلاف کوئی جارحانہ عزائم نہیں ہیں۔ استعماری تسلط کے دوران مسلمانوں نے نظریاتی، اقتصادی، سیاسی، ثقافتی حتیٰ کہ اخلاقی لحاظ سے نقصان اٹھایا ہے۔ تاہم مسلم ریاستوں کی آزادی کے بعد سیاسی لحاظ سے انہوں نے کچھ پیش رفت کی ہے۔ اس وقت ان کی کوشش یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان، اقدار اور تاریخ کی روشنی میں اقتصادی، تکنیکی، تعلیمی، نظریاتی اور ثقافتی پہلوؤں سے اپنی زندگیوں کو استوار کر سکیں۔ وہ الگ تھلگ ہو کر رہنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ دوسری اقوام کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں، لیکن وہ دوسروں کے "باج گزار" اور تابع مہمل بن کر نہیں، انسانی حلقے کے باوقار رکن کی حیثیت سے عزت اور احترام کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔

۳

بنیاد پرستی کا ہوّا

"بنیاد پرستی" واضح طور پر عیسائی مذہب کا ایک مظہر ہے، اس کا اسلامی فکر و عمل میں کوئی مقام نہیں ہے۔ ماضی قریب کی مغربی تاریخ میں یہ اصطلاح امریکہ کے ان انجیلی لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے، جو بائبل کی لفظی تعبیر کے علم بردار اور کنواری مریم کے بطن سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت پر ایمان رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی نظر میں نہ صرف ذاتی سیرت و کردار مسیحی اخلاقیات پر مبنی ہونا چاہیے، بلکہ سماجی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد بھی مسیحی اخلاقیات ہے۔ انھوں نے مغربی زندگی اور ثقافت کے بعض پہلوؤں پر کڑی نکتہ چینی کی اور انہیں مسیحی اخلاقیات سے کھلا انحراف قرار دیا۔ ان گروہوں کو مخالفین نے انتہا پسند اور جنونی قرار دیا، اس لیے ان کے لیے "بنیاد پرست" کی اصطلاح منفی معنوں میں استعمال کی جانے لگی۔

چنانچہ اس واضح مسیحی اصطلاح کو مسلمانوں پر چسپاں کرنا نہ صرف غلط اور بدنیتی پر مبنی ہے، بلکہ سیاسی لحاظ سے بھی قابل نفرین ہے۔ اسلام میں روحانی اور مادی زندگی میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ روحانی اور دنیی زندگی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اسلام میں سیاست اور مذہب میں اس قسم کی کوئی مغائرت نہیں، جیسی عیسائی دنیا میں موجود ہے۔ قرآن خدا کا کلام ہے اور مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ اس کے ایک ایک لفظ پر ایمان رکھتا ہے۔ پورے قرآن پر ایمان ضروری ہے اور اس میں سے کچھ لینے اور کچھ چھوڑنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

۴

مغرب کے دُوہرے معیار اور اسلام

اکا دکا انسانی ناکامیوں کے باوجود تاریخ میں رواداری کے حوالے سے اسلام کا ریکارڈ نہایت شاندار ہے۔ اسلام اعتدال کا راستہ اختیار کرتا ہے اور وہ اپنے پیروکاروں کو انتہا پسندی سے احتراز کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام رواداری اور دوسروں کے جذبات کے احترام کی تعلیم دیتا ہے۔ معاصر مسلمان تشدد اور دہشت گردی کی مخالفت میں کسی بھی مہذب شخص سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو ان دوہرے معیارات پر حیرت ہے جن کا مظاہرہ مغربی دنیا کی قیادتوں نے کیا ہے۔ اگر کویت کے معاملے میں عراق کا غیر قانونی اور یک طرفہ قبضہ (اگست ۱۹۹۰ء) ایک جرم تھا، تو فلسطین پر اسرائیلی، کشمیر پر بھارتی اور بوسنیا پر سربیا کے قبضے کو بھی ویسا ہی جرم قرار دیا جانا چاہیے۔ اگر بعض مسلمانوں کے تشدد کی مذمت کی جاتی ہے تو ارضِ فلسطین میں اسرائیلی شہریوں اور قابض فوجوں کے کہیں زیادہ مظالم کی مذمت کیوں نہیں ہوتی؟ یہی صورتِ حال بھارت کے مسلم کش فسادات اور کشمیر میں بھارتی مظالم کی ہے۔ جابر حکمرانوں کے ستائے ہوئے افراد کی طرف سے تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے کہیں زیادہ گھناؤنا جرم کسی ریاست کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرف سے تشدد پر اتر آتا ہے۔ مستبد طرز حکومت بُرا ہے، لیکن یہ ہر کہیں بُرا ہونا چاہیے۔ ایسا کیوں ہے کہ دنیا کے کچھ حصوں میں مستبد حکومتوں کی حمایت کی جاتی ہے اور کچھ دوسرے حصوں میں ان کی مذمت؟ کیا پسند کے ظالم اور پسند کے مظلوم کا یہ فلسفہ منافقت نہیں ہے؟

ہر چند کہ جمہوری عمل پسندیدہ ہے، لیکن اسے ہر کہیں پسندیدہ ہونا چاہیے۔ مصر، الجزائر اور انڈونیشیا وغیرہ کے عوام برابر کا حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنی پسند کی حکومتیں منتخب کر سکیں۔ جب ان مسلم ملکوں میں، جن کے حکمران عالمی طاقتوں کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں، آزاد انتخابات سبوتاژ کر دیے جاتے ہیں تو مغرب کے بہت سے رہنماؤں کے ضمیر کوئی خلش محسوس نہیں کرتے۔

جب ترک قبرصیوں کو ہر طرح کے تعصب کا نشانہ بنایا گیا، ان کے حقوق سلب کر لیے گئے، انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا، حتیٰ کہ ان کا وجود ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو مغرب ٹس سے مس نہ ہوا۔ حد یہ ہے کہ قبرص میں ضامن طاقت کا کردار رکھنے والی برطانوی حکومت، جس کا قبرص میں فوجی اڈہ تھا، خاموش تماشائی بنی رہی۔ یونانی قبرصیوں کو موقع فراہم کیا گیا کہ وہ حتمی بغاوت برپا کریں، لیکن جب ترکی نے دوسری ضامن طاقت کے طور پر اپنا حق استعمال کیا تو ہر طرف ایک کہرام مچ گیا۔ لیبیا کو بھی اسی طرح کی یک طرفہ مداخلت، بین الاقوامی پابندیوں اور بلیک میل کے لیے نشانہ بنایا گیا ہے۔ آج بوسنیا ہرزے گووینا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کی ایک اور واضح مثال ہے۔

مغربی طاقتیں جارح فریق کو یہ پیغام دینے میں ناکام رہی ہیں کہ جارحیت کی کوئی سزا ہے۔ اس کے بجائے تمام اشارے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا مغربی دنیا، نیٹو اور امریکہ جیسی عالمی طاقت، اپنی تمام تر عسکری قوت کے باوجود سربیائی جارحین کے سامنے بے بس ہے، جنہیں اس بات کی کھلی چھٹی ہے کہ وہ جو مظالم چاہیں توڑتے رہیں، جس قدر زمین وہ چاہتے ہیں اس پر قبضہ کریں، جتنے لوگوں کو چاہیں قتل کریں اور جتنے رقبے کو چاہیں مخالفین کے وجود سے "پاک" کر دیں[5]۔ وہ جو بین الاقوامی قانون، امن اور سلامتی کے علم بردار ہیں، طاقت کا جواب طاقت سے دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ ٹوٹے ہوئے معاہدوں اور لاشوں کے ڈھیر پر اس لمحے کا انتظار کر رہے ہیں کہ جارح اپنا کام ختم کر لے، اور پھر یہ حرکت میں آئیں اور اپنا اثر و رسوخ استعمال

۵۔ مزید دیکھیے: عبداللہ اسلیخ "یوگوسلاویہ کا خاتمہ اور بوسنیا کے مسلمان" (ترجمہ اشفاق حسین) انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد ۱۹۹۳ء۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتے ہوئے جارح اور مظلوم کے درمیان ایک معاہدہ کرا دیں، تاکہ جارح نے جو کچھ طاقت کے اندھے استعمال سے حاصل کیا ہے، اسے سندِ جواز حاصل ہو جائے۔ جب مظلوم بوسنیائی مسلمان اپنے دفاع کے لیے امداد اور ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ان کے راستے میں اقوام متحدہ کی پابندیاں حائل ہو جاتی ہیں۔ اگر اتفاق سے کچھ ہمدرد "مہذب" رکاوٹوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو انہیں جنونی اور بنیاد پرست قرار دے دیا جاتا ہے۔ مسلم احیاء اور اس کی رفتار کو "جنونیت" اور "بنیاد پرستی" کہہ دینے سے روکا نہیں جا سکتا۔ اس سے اور تو کچھ نہیں ہوگا، صرف مسلم عوام کی نظروں میں مغربی قیادت کا اعتماد ہی مجروح ہوگا۔

مغرب کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اس قسم کے کوئی آثار نہیں، بلکہ اس بات کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے کہ مسلمان مسلح ہو کر مغرب پر دھاوا بول دیں یا وہ مغرب کے سیاسی نظام کے لیے کسی قسم کا خطرہ بن جائیں۔ مسلمان محض اپنے معاملات درست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اپنی اقدار اور تصورات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں سنوارنے کا حق چاہتے ہیں۔ اسلامی احیاء کی تحریکیں جدّت (Modernization) سے الرجک نہیں ہیں۔ وہ جدّت طرازی اور مادی ترقی کی حامی ہیں، لیکن یہ جدّت اور ترقی وہ اپنی ثقافت اور اقدار کے تناظر میں حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ یہ تحریکیں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتیں کہ ایک روشن تہذیب اور ثقافت کی حامل قوم پر کھلم کھلا یا ڈھکے چھپے ہتھکنڈوں سے مغربی تہذیب اور اس کی اقدار مسلط کر دی جائیں۔

اقتصادی یا ثقافتی استعمار بھی اتنا ہی بُرا اور تباہ کن ہے جتنا کہ سیاسی استعمار۔ دنیا زندگی بسر کرنے کے لیے صرف اسی صورت میں محفوظ جگہ بن سکتی ہے، جب تمام قومیں اور عوام یہ اصول تسلیم کر لیں کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنا مستقبل اپنے نظریات اور اصولوں کے مطابق تشکیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ خیالات کا آزادانہ مکالمہ ہونا چاہیے، مگر کسی خاص مجموعۂ اقدار، ثقافت یا نظام کو دوسروں پر طاقت کے زور سے مسلط کرنے سے اجتناب کیا جانا چاہیے۔ زندگی کی بوقلمونی اور ثقافتی و نظریاتی تنوّع کو حقیقی اور جائز تسلیم کرنے سے ہی مختلف اقوام اور عوام ایک دوسرے کے ساتھ امن اور دوستی کی فضا میں رہ سکتے ہیں۔

مسلم عوام کسی خاص ملک کی، چاہے وہ اقتصادی یا فوجی لحاظ سے کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، بالادستی تسلیم نہیں کرتے۔ چھوٹی قومیں اور کمزور ممالک بھی زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حق رکھتے ہیں۔ امریکی بالادستی (Pax-Americana) بھی اتنی ہی گھناؤنی چیز ہے، جتنی کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برطانوی بالادستی (Pax-Britainica) یا ہسپانوی بالادستی۔ یک قطبی (Uni-polar) دنیا یا ایک عالمی طاقت کی باتیں نئے خوف اور خدشات کو جنم دے رہی ہیں اور ایک نیا استعماری نظام ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی منصفانہ عالمی نظام کسی ایک کی بالادستی پر مبنی کارروائیوں کے ذریعے وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔

مسلم عوام اور تیسری دنیا کی اقوام نئی بالادستی کو کبھی قبول نہ کریں گی۔ چھوٹی اور بڑی، غریب اور امیر، کمزور اور طاقت ور سب اقوام کو جینے اور اپنی اقدار اور معیارات کے مطابق زندہ رہنے کا مساوی حق حاصل ہے۔ سب کو پھولنے پھلنے کے برابر کے مواقع ملنے چاہیں۔ کسی کی طرف سے دوسروں پر اپنی بالادستی کا تسلط ہی بین الاقوامی کشیدگی اور تصادم کی جڑ ہے۔ اگر مغرب انسانیت کو ایک منصفانہ عالمی نظام کی جانب پیش رفت میں مدد فراہم کرنے کے سلسلے میں واقعی سنجیدہ ہے، تو اسے ذرا زیادہ خود احتسابی سے بھی کام لینا چاہیے۔

۵

اسلام اور جمہوریت

یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ "اسلام جمہوریت کے خلاف ہے"۔ اس مفروضے کی بنیاد سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جمہوریت، فلسفیانہ سطح پر، انسان کی حاکمیتِ اعلیٰ کا اصول تسلیم کرتی ہے، نیز ابدی اور حتمی مذہبی یا اخلاقی قدروں سے انکار کرتی ہے۔ جمہوریت کا یہ فلسفیانہ تصور دنیا اور معاشرے کے سلسلے میں اسلامی نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلام خدا کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے اور اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ انسان کو الٰہی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ مسلمان کہا ہی اس شخص کو جاتا ہے جو الٰہی قانون کو اپنے انفرادی اور اجتماعی رویے کا سرچشمہ تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ اسلام میں جمہوریت کا سرے سے کوئی وجود نہیں، غلط فہمی یا دانستہ مغالطہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام نے انسانی نیابت (خلافت) کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ خلافت بحیثیتِ مجموعی عوام کو حاصل ہے، یہ کسی ایک گروہ یا طبقے یا خاندان تک محدود نہیں۔ الٰہی قانون اس کے لیے دائرہ کار فراہم کرتا ہے۔ اس نظامِ قانون میں لچک اور تبدیلی کی وسیع گنجائش ہے جو "مباح" کے ذیل میں آتی ہے۔ کتاب اللہ کی تشریح و تعبیر کا حق ہر اس شخص کے لیے ہے جو علم رکھتا ہے اور جس میں اس کی تفہیم و تعبیر کی صلاحیت موجود

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ اسلام کے قانونی نظام کے دائرہ کار میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔

اسلام میں حکمرانی کا اختیار کسی کو اس کے مذہبی منصب کی بنیاد پر نہیں دیا گیا۔ معاشرے کے تمام افراد کا نہ صرف یہ حق، بلکہ فرض ہے کہ وہ اقتدار کی باگ ڈور ان افراد کے حوالے کریں جن پر انہیں اعتماد ہے۔ سیاسی قیادت عوام اور خدا کے سامنے براہِ راست جوابدہ ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام میں قانون کی حکمرانی ہے اور اس میں اقلیتوں سمیت معاشرے کے تمام ارکان کے بنیادی حقوق کے تحفظ کا اصول موجود ہے۔ حکومت کے جواب دہ ہونے کا تصور اسلامی نظام میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح قیادت کا عوام کی مرضی سے انتخاب اور اس کی برخواستگی مسلّمہ اصول ہے، اور یہی بات اختلافِ رائے اور عدمِ اتفاق کے سلسلے میں درست ہے۔

عملی سطح پر اسلام کا سیاسی نظام ان اصولوں پر مبنی ہے اور اس طرح جمہوری عمل کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام سیاسی میدان میں جن مقاصد کے حصول کا خواہش مند ہے، انہیں مسلم دنیا کی بعض حکومتوں کے طور طریقوں کے ساتھ گڈمڈ نہ کیا جانا چاہیے، چاہے وہ اسلام کا نام ہی کیوں نہ استعمال کرتی ہوں۔ یہ سب کچھ معاصر دنیا میں جمہوریت کی ناگوار صورت حال کے قریب قریب ہے۔ بہت سے جمہوریت کے دعویدار حقیقت میں جمہوری اصولوں کی پاسداری نہیں کر رہے۔ اس انحراف کو جمہوریت کی ناکامی پر محمول نہ کیا جانا چاہیے، بلکہ اسے محض کچھ لوگوں یا ملکوں کا انحراف خیال کرنا چاہیے۔

اگر اسلامی جمہوری نظام کو اس پسِ منظر میں دیکھا جائے تو اسے الٰہی تعلیمات پر مبنی جمہوری نظام سمجھا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکردہ مسلم مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء - ۱۹۷۹ء) نے اسلام کے سیاسی نظام کو "الٰہی جمہوری" (Theo - democratic) قرار دیا ہے۔ اسلام میں تھیوکریسی کی کوئی گنجائش نہیں[۶]، کیونکہ تھیوکریسی میں ایک مخصوص مذہبی گروہ کو مذہبی قانون کی تعبیر کا حق حاصل ہوتا ہے اور وہی گروہ سیاسی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔ اسلام ایسے کسی بھی مذہبی انتظام کی حمایت نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اسلام قانون کی حکمرانی اور قانون کی نظر میں سب کے مساوی ہونے پر زور دیتا ہے۔ یہ جواب دہی کے اصول اور عوام کی مرضی سے حکومت کی تبدیلی اور تشکیل کا علم بردار ہے۔ آج مسلمانوں کو اس بات پر بجا طور پر

۶۔ دیکھئے: سید ابوالاعلیٰ مودودی "اسلامی ریاست" (مرتب، خورشید احمد) اسلامک پبلی کیشنز، لاہور۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تشویش ہے کہ اسلام ایک طرف جمہوریت مخالف نظریے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، اور دوسری طرف جمہوری عمل سے ابھرنے والی اسلامی قوتوں کو اپنے ہی ملکوں میں برسراقتدار آنے کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے، جیسا کہ حال ہی میں الجزائر میں ہوا ہے اور اسلامی جمہوری قوتوں کا راستہ روکنے والوں کو مغرب کی پوری تائید حاصل ہے۔

٦

اسلامی احیاء اور "نیو ورلڈ آرڈر"

آج کے مسلم ذہن کو سمجھنے کے لیے اسلامی احیاء کے بعض اہم پہلوؤں کا جائزہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ مسلمان ایک نئے منصفانہ عالمی نظام کے وجود میں آنے کے شدت سے منتظر ہیں، نہ کہ محض نئے عالمی نظام کے، جس میں کسی ایک ملک کی بالادستی مقصود ہو۔ اسلامی احیاء نہ صرف منفرد ہے بلکہ عالمگیر بھی ہے۔ اسلام میں تنوع کے ساتھ وحدت ہے، اور یہ تنوع انفرادیت کو مجروح نہیں کرتا۔ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ اس میں "عرب اسلام"، "پاکستانی اسلام"، "ایرانی اسلام" یا "ترک اسلام" نام کی کوئی چیز نہیں ہے، تاہم اسلامی عالمگیریت میں وحدت ہے، یکسانیت نہیں۔

اسلام میں بعض نمایاں پہلو ہیں جو ہر جگہ مشترک ہیں۔ لیکن اس سے تحریک کی زرخیزی متاثر نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر عربی، قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ کی زبان ہے، لیکن یہ لازمی طور پر تمام مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ اگرچہ ہر ایک مسلمان کچھ نہ کچھ عربی زبان سیکھتا ہے لیکن دیگر زبانیں بولنا اور انہیں ایسے تصورات کو پروان چڑھانے کے لیے، جو اسلامی روایات سے مطابقت رکھتے ہوں، بطور آلہ استعمال کرنا کچھ کم اسلامی نہیں ہے۔

مسلمان اپنا احتساب خود کرتے ہیں۔ وہ سماجی زندگی کے سطحی مظاہر کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور قرآن و سنت میں بیان کردہ بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عمل میں ان علامات مثلاً بعض مخصوص رسوم یا فقہی ضوابط کی بعض تفاصیل وغیرہ، سے بے پروائی بھی شامل ہو سکتی ہے، جو مذہبی روایات کا حصہ بن چکی ہیں۔ حالیہ تحریک احیاء اسلام کی بنیادی روح یہی "اصل کی جانب رجوع" ہے۔ بنیادی منابع کی جانب رجوع ایک آزادی بخش قوت ہے۔ اسلام میں اس سے ایک متحرک عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ بنیادی منابع کی جانب رجوع "بنیاد پرستی" کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جنم نہیں دیتا، جو انسان کو وقت کے ساتھ چلنے نہیں دیتی۔ بلکہ یہ عمل زاویۂ نظر کی تازگی، ایک نئی لگن، نیا تحرک اور نئی لچک دیتا ہے، نیز چیلنجوں کا سامنا کرنے کی اہلیت دیتا ہے۔ لوگ اسلام کو تہذیب اور ثقافت کے ماخذ کے طور پر دوبارہ دریافت کر رہے ہیں اور اس دریافت کو معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔

میری رائے میں، جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں مغرب کی غلامانہ نقالی سے دوری پیدا ہوتی جارہی ہے اور جو کچھ ہم کرتے ہیں، اس میں فرق آتا جارہا ہے۔ مغربی تجربے سے ہم متعدد طریقوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، مگر ہم غیر ملکی ثقافتوں کو اپنے ہاں مسلط کرنے کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال ہونے کو تیار نہیں۔

بلاشبہ تمام مسلم ممالک کا مغربی ثقافت کی جانب رویہ یکساں نہیں ہے۔ وہ ملک جو کچھ عرصہ پہلے مغربیت پرستی کے ہراول دستے میں شامل تھے، وہ اب اسلامی احیاء کے علمبردار ہیں۔ جبکہ ایسے ممالک جو دنیا سے کافی پیچھے دکھائی دیتے تھے، اور اپنی روایات کے ساتھ سختی سے چمٹے ہوئے تھے، اب مغربی طرزِ زندگی اور ثقافت کے دلدادہ ہیں۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ "کیا مسلم ممالک ترقی اور ٹیکنالوجی کے معاملات کو مسترد کرنے کے حقیقی معنوں میں متحمل ہوسکتے ہیں، جو ان کی علاقائی خوش حالی اور ان کے انسانی وسائل کی ترقی کی بنیاد ہیں؟" یہ سوال اس مسئلے پر پائے جانے والے الجھاؤ کا ایک جامع خلاصہ ہے۔ ترقی اور ٹیکنالوجی سے کسے انکار ہے، لیکن حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ کس قسم کی ترقی، اور کن مقاصد کے لیے؟ کیا یہ محض اقتصادی ترقی ہوگی یا مجموعی انسانی ترقی جس میں اقتصادی، سماجی، اخلاقی اور نظریاتی پہلو شامل ہیں اور یہ ترقی منصفانہ سماجی نظام کے قیام پر منتج ہوگی؟ کیا ہمارے پیشِ نظر ایک ایک ریاست کے تناظر میں ترقی کا تصور ہے یا امتِ مسلمہ کی ترقی مقصود ہے۔ کیا اس کا مطلب حالیہ تاریخ کی جانب رجوع ہے کہ مسلم قومی ریاستوں کو ختم کیا جائے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم ریاستیں امتِ مسلمہ کے لیے ایک نئے مستقبل کی تشکیل پر توجہ دیں۔

میری رائے میں حالیہ تاریخ کی طرف واپسی کا کوئی سوال نہیں ہے، لیکن ہم ماضی قریب کے اپنے پیش رووں کے مقابلے میں زیادہ تعمیری انداز میں پیش رفت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم قومی ریاست کو ایک نکتۂ آغاز کے طور پر قبول کر سکتے ہیں، اگرچہ "قومی ریاست" مسلم نقطۂ نظر سے مثالی ریاست نہیں ہے۔ تاہم موجودہ وقت کی حقیقت یہی ہے، اور ہم سیاسی نظاموں کو فی الفور ختم نہیں کرنا چاہتے۔ ہم امتِ مسلمہ میں اتحاد، قریبی تعاون اور مختلف مسلم ریاستوں میں یک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جہتی کے احساس کو مزید پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ اسلامی عینیت کے حوالے سے ہر قومی ریاست بتدریج ایک نظریاتی ریاست بن جائے گی، اور ان کا اتحاد بالآخر اسلامی دولت مشترکہ پر منتج ہوگا۔

اسلامی تحریک کی طاقت کیا ہے اور یہ کیا کچھ کر سکتی ہے؟ مغرب اسے سمجھنے میں ناکام رہا ہے۔ مغرب نے اسے "بنیاد پرست، جنونی، مغرب مخالف، بے وقعت" اور نہ جانے کیا کیا بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ رویہ ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد و معاون نہیں ہو سکتا۔ ایسا لگتا ہے کہ مغرب ایک بار پھر یہ خطرناک غلطی کر رہا ہے کہ وہ ایک مختلف طرزِ زندگی رکھنے والوں کو اپنے مخصوص معیارات اور مسخ شدہ تصورات کے آئینے میں دیکھ رہا ہے۔

اس افسوس ناک نقطۂ نظر کے نتیجے میں انسانیت پر بے پناہ مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ اسی طرح مغرب کے عوام اور پالیسی سازوں کو اسلامی احیاء کی حقیقی نوعیت کے بارے میں غلط معلومات فراہم کی جا رہی ہیں اور انہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی تاریخ کے ایک ناخوشگوار باب کی روشنی میں ان معاملات کو دیکھیں۔ تحریکِ احیائے اسلام مستقبل کی جانب دیکھنے والی ایک تحریک ہے اور عیسائی گروہوں کی بنیاد پرستانہ سوچ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس نے جدت سے وابستہ مسائل اور ٹیکنالوجی کے چیلنجوں سے آگاہ ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اسلام کے اصل ماخذوں، یعنی قرآن اور سنت پر اس کا زور دینا اس کی لچک کا مظہر ہے۔ اس میں اختراع کی صلاحیت ہے، کیوں کہ احیائے اسلام کی تحریک میں قدامت پرستی کا رویہ نہیں ہے کہ کسی مخصوص فقہی مسلک سے ہی منسلک رہا جائے۔ یہ تمام امکانات ان تجزیہ نگاروں کی طرف سے نظر انداز کر دیے جاتے ہیں جو موجودہ اسلامی دنیا کو ایسی Categories کی صورت میں دیکھتے ہیں جو اسلامی دنیا سے متعلق ہی نہیں۔

موجودہ مسلم ذہن کو اس وقت تک صحیح معنوں میں نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک ہمیں اس بات کا احساس نہ ہو کہ موجودہ پریشان کن صورت حال کے بارے میں مسلمانوں کا ادراک، محض سیاسی بے چینی سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ اسلامی احیاء کو سمجھنے کی کوششیں اکثر سراسر سطحی اور متعصبانہ ہیں۔ یہ نظریہ کہ اسلامی احیاء، بالخصوص ایران کا تجربہ، محض تیز رفتار ترقیاتی کوششوں کا نتیجہ ہے، نہایت ہی سادہ توجیہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترقیاتی پہلو کے اپنے مسائل ہیں، لیکن یہ کہنا سراسر سادہ لوحی کے مترادف ہے کہ مسلم عوام کا اسلامی احیاء کی قوتوں کی طرف بڑے پیمانے پر رجوع اس تناؤ کی وجہ سے ہے جو تیز رفتار اقتصادی ترقی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیے کی جانے والی کوششوں کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ یہ تشخیص، مسلم معاشرے کے جذبوں کے بارے میں گہری لاعلمی پر مبنی ہے۔

اسی طرح اسلامی احیاء کو محض مغربی استعمار کے خلاف عوام کا غم و غصے سے بھرپور ردعمل قرار دینا بھی گمراہ کن ہے۔ استعمار کے خلاف ردعمل میں کوئی شک نہیں ہے، تاہم یہ ردعمل سیاسی طیش کے اظہار سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ایک زیادہ گہری وجہ ان تصورات، اقدار، حکومت کے نظام اور اداروں سے عدم اطمینان ہے، جو مغرب سے درآمد کر کے ان پر مسلط کیے گئے ہیں۔ ان کا یہ عدم اطمینان اپنی قیادت سے ہے، جسے وہ مغربی مفادات سے وابستہ خیال کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قیادت مغربی ترقی کے نمونوں اور اقدار کو مسلم معاشروں پر مسلط کرنے کے لیے محض آلہ کار ہے۔ اس طرح یہ احیاء ایک ہمہ جہتی مظہر ہے۔ ایک طرف یہ عوام کی امنگوں اور تاریخی آئینے میں مسلم تشویش کا اظہار ہے، جو حقیقتاً اندرونی اور مقامی عناصر پر مبنی ہے۔ دوسری جانب یہ بیرونی چیلنج کے خلاف ردعمل بھی ہے اور یہ چیلنج استعمار کے خاتمے پر مسلم معاشرے میں بیرونی مداخلت ہے۔

اسلامی احیاء کی تحریک موجودہ مسلم صورتِ حال کی ناقد ہے اور یہ ہمارے دور کے غالب کلچر، یعنی مغربی تہذیب و ثقافت کی بھی ناقد ہے جو اکثر ملکوں میں چھائی ہوئی ہے۔ یہ تنقید ایک مختلف بنیاد اور مختلف زاویۂ نظر یعنی اسلام کے اصل ماخذوں —— قرآن اور سنت —— کے حوالے سے ہے۔

یہ تحریک ایمان کے احیاء کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسلامی احیاء کی یہ جہت بیشتر مغربی تحریروں میں نظر انداز دکھائی دیتی ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ "یہ محض سیاسی اور سماجی ترتیبِ نو کا سوال ہے"۔ سماجی نظم یقیناً اہم ہے لیکن نکتہ آغاز ایمان کا احیاء اور اس کا استحکام ہے نیز فرد کی اخلاقی شخصیت اور اس کے کردار کی تعمیرِ نو ہے۔ روحانیت اور عینیت پسندی کا بے پناہ جذبہ ہے جو سمت کے لیے ایک نیا احساس ابھار رہا ہے اور لوگوں کو اپنی دنیا کی تعمیرِ نو پر آمادہ کر رہا ہے، چاہے اس کے لیے کوئی سی بھی قربانی دینی پڑے۔

استعماری دور میں اور اس کے بعد قیادت کا جو نمونہ سامنے آیا، اس میں ذاتی مفادات کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ اخلاقی قدروں سے اس قدر تہی دامن ہے اور بدعنوانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہمارے ملکوں میں بدعنوانی اور استحصال طرزِ زندگی بن گیا ہے۔ مسلمانوں کی اپنی کمزوریاں ہیں اور انہیں عالمی صورتِ حال میں بہت دھچکے برداشت کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پڑے ہیں، تاہم بدعنوانیوں کا موجودہ طوفان جو آج مسلم دنیا میں دیکھا جا رہا ہے، بالکل نئی صورت حال ہے۔ مسلمان اس صورتِ حال کو سیکولرازم اور مغربیت کے اثرات بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں انفرادی اور اجتماعی اخلاق جو توحید اور سنت رسول ﷺ سے وفاداری پر مبنی تھے، غیر ملکی اثرات کے زیر اثر کمزور پڑ گئے ہیں۔ "مسلم تجدد پسندی" مسلم ممالک میں سیکولرازم کے نفوذ کی کوشش تھی، اس نے مغربی لبرل ازم کی اقدار کو مسلم معاشرے پر اوپر سے تھوپنے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے پر روایتی اقدار کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ لیکن اس خلا کو پُر کرنے کے لیے کوئی نئی اخلاقیات وجود میں نہ آ سکی۔ یہ وہ اخلاقی خلا ہے جس میں اقتصادی ترقی اور مادی خوش حالی کے نام پر ذاتی مفادات کے حصول، اپنی دولت میں اضافے اور سماجی و اقتصادی استحصال کی کوششیں عام ہو گئیں۔ اسلامی احیاء معاملات کی اس صورت حال کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ اسلامی اخلاق کی بحالی اور امت کے مادی اور انسانی وسائل کو امت میں سماجی انصاف اور خود انحصاری کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ مسلم نوجوان اسلام کے فراہم کردہ اصولوں اور سیرت رسول ﷺ کے مطابق اپنی انفرادی اور سماجی زندگی کی تعمیرِ نو کے جذبے سے سرشار ہیں۔ اور وہ نہ صرف ایک نیا سماجی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ نیا عالمی نظام دنیا کے تمام پسے ہوئے لوگوں کے لیے امن، وقار اور انصاف کا ضامن بن کر ابھرے۔

آخر میں، میں یہ کہوں گا کہ اسلامی احیاء بنیادی طور پر مسلم معاشرے کی اندرونی، مقامی، مثبت اور نظریاتی تحریک ہے۔ یہ لازمی امر ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اس کا دوسری قوتوں سے ربط ہو بلکہ ٹکراؤ بھی ممکن ہے۔ مسلمانوں کا مغرب کے ساتھ، بالخصوص نوآبادیاتی دور میں قریبی ربط سمجھ میں آتا ہے، لیکن یہ اسلامی جوابی رویے کا سب سے زیادہ فیصلہ کن عنصر نہیں رہا۔

مسلمان اپنا سماجی اور اقتصادی نظام اسلامی اقدار کے مطابق استوار کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کا ان قوتوں سے تصادم لازمی ہے جو موجودہ حالات (Status - quo) کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے حق میں ہیں، اس لیے کشمکش ہو گی۔ اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مغربی تہذیب پر مسلمانوں کی تنقید بنیادی طور پر سیاسی تصادم کی کوئی مشق نہیں ہے۔ حقیقی معرکہ دو ثقافتوں اور تہذیبوں کی سطح پر ہو گا۔ ایک تہذیب اسلامی اقدار پر مبنی ہو گی اور دوسری کی اساس مادیت، قومیت پرستی اور سیاسی و اقتصادی لبرل ازم پر ہو گی۔ اگر مغربی ثقافت، عیسائیت، اخلاق کی مستقل اقدار اور ایمان پر مبنی ہوتی تو ربط یا مقابلے کی زبان اور طریقِ کار کی نوعیت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مختلف ہوتی، لیکن صورت حال یہ نہیں ہے۔ انتخاب، "الہامی اصول" اور ایک سیکولر مادی کلچر کے درمیان ہے، اور یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کہ اس مقابلے کو تمام باشعور انسان محض مغرب اور مشرق کی جغرافیائی، سیاسی حد بندیوں یا عیسائیت بمقابلہ اسلام کے انداز میں دیکھیں گے۔ درحقیقت وہ تمام انسان، چاہے وہ دنیا کے کسی خطے میں رہتے ہوں، جنہیں ہمارے دور کے روحانی اور اخلاقی بحران پر تشویش ہے، وہ اسلامی احیاء پر اطمینان کا سانس لیں گے، نہ کہ وہ اس سے خائف ہوں گے۔

اقدار اور ثقافت کی سطح پر جاری تنازعے کی نوعیت واضح ہو جانے کے بعد میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس صورتِ حال کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ مسلم احیاء میں کوئی مغرب مخالف جراثیم نہیں ہیں۔ مغربی ملکوں اور مسلم دنیا کے درمیان سیاسی تعلق کے حوالے سے یہ تحریک نہ تو مغرب کے حق میں ہے نہ اس کے خلاف، حالانکہ مسلم ممالک اور مغرب کے درمیان دورِ استعمار کی تلخ یادیں موجود ہیں جو تعلقات کو مجروح کرنے کے امکانات رکھتی ہیں۔ اگر چین اور امریکہ کسی مشترکہ ثقافت اور یکساں سیاسی و اقتصادی نظام کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کر سکتے ہیں، تو مغرب اور مسلم دنیا آپس میں ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ بہت حد تک اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ مغرب، اسلامی احیاء کو کن نظروں سے دیکھتا ہے اور اگر مسلم ذہن اور مسلم نقطۂ نظر سے، مغربی طاقتیں، مسلم معاشرے پر مغربی ماڈل مسلط کرنے اور مسلمانوں کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر مغربی غلبے کے نظام کے ساتھ وابستہ رکھنے اور مسلم کلچر اور سوسائٹی کو براہ راست یا بالواسطہ غیر مستحکم کرنے کی کوششیں جاری رکھتی ہیں تو ظاہر ہے کہ کشیدگی بڑھے گی، اور باہمی اختلافات میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔

اور اگر معاملات، مکالمے اور افہام و تفہیم کے ذریعے پُرامن طور پر، ایک دوسرے کے حقوق کے احترام کے جذبے سے حل نہ ہوئے، تو ان کا دوسرے طریقے سے حل ہونا ناگزیر ہے۔ دوسری طرف اگر ہم تسلیم اور اعتراف کریں کہ یہ ایک مختلف طرز کے معاشروں کی دنیا ہے، مغربی کلچر دوسری ثقافتوں اور تہذیبوں کے شانہ بشانہ ان پر غلبہ پائے بغیر پھل پھول سکتا ہے، اور دوسرے لوگ لازمی طور پر دشمن نہیں ہیں، تو اس صورت میں اس بات کا حقیقی امکان ہے کہ ہم اختلاف رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سیکھ سکیں۔ اگر ہم اس نقطۂ نظر کی پیروی کے لیے تیار ہیں تو ہم بہت سی مشترکہ بنیادیں اور مشترک چیلنج تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہی مستقبل کے عالمی نظام کی کلید ہے۔ کیا ہم تمام ثقافتوں، مذاہب اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اقوام کی بقائے باہمی، بلکہ انہیں اپنی بقاء میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو مستقبل روشن ہے۔ مسلم دنیا انسانیت کے روشن مستقبل کے لیے جدوجہد کرنا چاہتی ہے، تاہم اس کا زیادہ تر انحصار مغرب پر ہے کہ وہ اس چیلنج کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصہ دوم

اسلامی احیاء، بنیاد پرستی اور اسلامی تحریک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بنیاد پرستی اور اسلامی تحریک

سوال: آپ اسلامی انقلاب، اسلامی نشاۃ ثانیہ، احیائے اسلام اور اتحادِ عالم اسلامی کے پرچم تلے اسلامی قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں، لیکن آپ کے بارے میں مغرب نے بنیاد پرستی (Fundamentalism) کی اصطلاح وضع کی ہے۔ ان کے نزدیک "بنیاد پرست لوگ غیر لچک دار، غیر مہذب اور منتقم مزاج ہوتے ہیں"۔ عام طور پر محض مذہبی رسم و رواج ادا کرنے والے لوگوں، پارٹیوں، صوفیوں اور علماء کو وہ بنیاد پرست نہیں گردانتے۔ آپ "فنڈامینٹل ازم" کی اصطلاح کے محرکات پر کلام فرمائیے اور یہ بتائیے کہ یہ اصطلاح کہاں تک جماعت اسلامی، اخوان المسلمون، افغان مجاہدین، سوڈان و الجزائر کی اسلامی انقلابی قوتوں، کشمیری حزب المجاہدین، فلسطینی حماس تحریک کے ساتھ ہی ساتھ عرب دنیا کی بعض بادشاہتوں اور فوجی آمریتوں کی مخالفت کرنے والے راسخ العقیدہ مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے؟

جواب: یہ سوال کئی جوابات کا متقاضی ہے۔ میں مختصراً عرض کروں گا کہ اہلِ مغرب نے عالم اسلام پر جو مختلف ستم کیے ہیں ان میں سے ایک ستم یہ بھی ہے، کہ وہ ہم کو ہمارے اپنے نام سے پکارنے کے بجائے خود اپنی پسند کے ناموں اور عنوانوں سے ہمیں نوازتے ہیں۔ ایک طرف انسان کے بنیادی حقوق کا پرچار کرتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے اس حق کے بھی معترف نہیں کہ ہم اپنی پسند کے نام سے پکارے جائیں۔ اسلام کو صدیوں تک "محمڈن ازم" (Muhammedanism) کہا گیا اور آج بھی اسلام اور مسلمان کی اصطلاح کے استعمال کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے گریز کیا جاتا ہے۔ اب ایک عرصے سے جس نئے نام سے ہمیں نوازا جا رہا ہے، وہ "بنیاد پرستی" (Fundamentalism) ہے۔ لغوی اعتبار سے اس میں کوئی زیادہ خرابی نہیں کہ "بنیاد پرست" سے مراد وہ شخص ہے، جو اپنے عقیدے اور مسلک کی بنیادوں پر قائم ہو اور ان کے بارے میں کسی مداہنت یا سمجھوتے کا مظاہرہ نہ کرتا ہو۔ اس حیثیت سے نظریہ اور اصول کے ہر علم بردار کو "بنیاد پرست" کہا جا سکتا ہے۔

لیکن درحقیقت یہ اصطلاح اتنی معصوم نہیں ہے، اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ تاریخ کے دو ادوار میں یہ اصطلاح عیسائی مذہب کے ان پیروکاروں کے لیے استعمال ہوئی جو تنگ نظر، لکیر کے فقیر، ترقی کی مخالفت اور اپنی آراء پر تشدد کے قائل رہے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں بھی ایک مختصر مدت کے لیے یورپ میں اسے استعمال کیا گیا، لیکن یہ اصطلاح زیادہ عام نہ ہو سکی۔ پھر انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں امریکہ میں ان عیسائی تبلیغ پرستوں (Evangelist) کے لیے اسے استعمال کیا گیا جو بائبل کی لفظی تعبیر کے قائل تھے، جو بائبل کے بنیادی عقائد پر سختی سے قائم تھے اور حضرت مریم کے بطن سے، جو پاک دامن اور غیر شادی شدہ تھیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش (Virgin Birth) اور ان کے جسمانی طور پر اٹھائے جانے اور جسمانی طور پر دوبارہ آنے کے قائل تھے۔ جو مغربی سائنس کے بہت سے نظریات کی مذہبی بنیادوں پر مخالفت کرتے تھے۔ خصوصیت سے ڈارون کے "نظریہ ارتقاء" کی اور اس نظریئے کی تعلیمی اداروں میں تدریس کے بھی خلاف تھے۔ یہ گروہ ایک تحریک کی حیثیت سے رونما ہوا اور اس نے امریکہ کے ایک وسیع علاقے میں اپنے اثرات پھیلا لیے۔ اس نے جو سلسلہ کتب شائع کیا اسے The Fundamentals کا نام دیا گیا اور اسی سے اس تحریک کا نام Fundamentalist اخذ کیا گیا۔

اسے خود اس نام پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ اس نے روایتی عیسائیت کے مقابلے میں اپنے لیے مخصوص مسلک کو پسند کیا اور پھر اس مسلک کی روشنی میں اپنے کلیسا اور دوسرے ادارے بنائے، کتب و رسائل کی اشاعت کی، تبلیغی سرگرمیوں کا اہتمام کیا اور تہذیبی، معاشی، سائنسی اور سیاسی میدانوں میں اپنے لیے مخصوص نقطۂ نظر کو پیش کیا اور جن لوگوں نے ان کے مسلک کی مخالفت کی ان کا مقابلہ مذہبی تشدد کے ساتھ کیا۔ اس تحریک کے عروج کا زمانہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۶ء تک رہا۔ اگرچہ اب بھی اس کے اثرات اور پیروکار پائے جاتے ہیں۔ اس گروہ نے خود اپنی الٰہیات (Theology) وضع کی اور اس کی روشنی میں مشن کی حکمت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عملی اور بیسویں صدی کے تہذیبی معاملات پر اپنا موقف مرتب کیا۔ عیسائیت کے روایتی علم برداروں نے اس تحریک کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور بالآخر امریکہ میں ہی نہیں، بلکہ یورپ میں بھی "بنیاد پرستی" کی اصطلاح ان عیسائی گروہوں پر منطبق کی جانے لگی، جو وقت کے دھارے سے باہر اور عیسائی دنیا کے معتمد اور معتبر مذہبی مسلک کے باغی، تنگ نظر، لفظ پرست اور تشدد کے قائل سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح اس اصطلاح میں ذم کا ایک پہلو شامل ہو گیا اور آہستہ آہستہ میڈیا اور پریس نے تو اس کو ایک "گالی" بنا دیا۔

گزشتہ بیس پچیس سال سے امریکہ کے اہلِ قلم اس اصطلاح کو مسلمانوں کے لیے استعمال کرنے لگے ہیں اور ایران کے انقلاب کے بعد تو ذرائع ابلاغ اور سیاستدان سب ہی نے اس اصطلاح کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا ہے۔ انیسویں صدی بلکہ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں چوٹی کے مستشرقین کے یہاں ہمیں مسلمانوں کے لیے اس اصطلاح کے استعمال کی کہیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن انقلاب ایران کے بعد تو ایک طوفان سا اُمڈ آیا ہے اور اس ٹوپی کو جو خالص عیسائی دنیا کی چیز ہے، اسے مسلمانوں کے سر منڈھنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اب تو یہ سوچ کا دھارا سا بنتی جا رہی ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اس کے استعمال کو اسی طرح ناپسند کیا ہے، جس طرح ماضی میں مسلمانوں نے "محمڈن ازم" کی اصطلاح کو اسلام کے بدل کے طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ تازہ ترین عنایت یہ ہے کہ اس اصطلاح کے اسم مسمیٰ کے طور پر احیائے اسلام کی تحریکوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ان تحریکوں نے اپنے لیے خود بڑے مناسب نام منتخب کیے ہیں اور انھی ناموں سے ان کی اصل خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ اسلامی تحریکات اس معنی میں ہرگز "بنیاد پرستی" کی قائل نہیں کہ مذہب کی کچھ تعلیمات بنیادی ہیں اور نئی تعمیر صرف ان منتخب شدہ بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ بلکہ ان کی نگاہ میں پورا قرآن اور تمام سنت نبوی ﷺ دین کی اساس ہے اور ان میں سے کسی کو بھی ترک و اختیار کا ہدف نہیں بنایا جا سکتا۔ ان کی تو پکار ہی یہ ہے کہ ادخلو فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوط الشیطان۔ "دین میں پورے کے پورے آجاؤ اور (زندگی کو خانوں میں بانٹنے یا کچھ کو اختیار کرنے اور کچھ کو ترک کرنے) کے شیطانی طریقوں کی پیروی نہ کرو"۔ ان کے لیے "بنیاد پرستی" کی مغربی اصطلاح کیسے استعمال کی جا سکتی ہے؟

دوبارہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے یہ کہوں گا کہ آج اسلامی تحریکیں دراصل ترقی، خوش حالی اور تبدیلی کی داعی کے طور پر میدانِ عمل میں موجود ہیں۔ جبکہ مغرب، امریکہ اور ان کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"دیسی پرستار" انہیں اس کے بالکل برعکس پیش کر رہے ہیں، جس کا عنوان انہوں نے "ترقی کا دشمن، لکیر کا فقیر اور بنیاد پرست یا "فنڈامینٹلزم" رکھا ہے"۔ یہ ساری کی ساری چیزیں جو کہ مغرب کے تصور "بنیاد پرستی" کا آمیزہ ہیں وہ ان کو غلط طور پر اسلامی تحریکوں کے سر تھوپ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس لفظ کا استعمال اسلامی تحریکوں کے لیے بالکل غلط اور بے جا ہے۔ ہمیں کوئی معذرت خواہی نہیں کرنی چاہیے۔ مجھ سے جب بھی مغربی دانشوروں یا ان کے حاشیہ نشینوں نے یہ سوال کیا تو میں نے ان سے یہ بات کہی کہ اگر فنڈامینٹلزم اس بات کا نام ہے کہ میں اسلام کو ہدایت کا سرچشمہ فیض تسلیم کروں اور آج کے دور میں وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس جذبے اور روح کی بنیاد پر، کسی ذہنی تحفظ کے بغیر ایک نظام تشکیل دینے میں اپنا حقیر سا حصہ ادا کروں تو مجھے اس پر فخر ہوگا۔ اس عمل کے نتیجے میں آپ چاہے مجھے فنڈامینٹلسٹ (بنیاد پرست) کہیں، چاہے اسلامسٹ کہیں، چاہے قدامت پسند کہہ لیں یا اسی طرح کچھ اور کہیں، مجھے اس پر کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا ہو رہا ہے کہ ایک غلط تصور کو گھناؤنے انداز سے ایک گالی نما اصطلاح میں لپیٹ کر پیش کیا جا رہا ہے اور اسے ناروا طور پر اسلامی تحریکوں پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ یہ عمل اس حکمت عملی کے طور پر کیا جا رہا ہے کہ پہلے ایک چیز کو بُرا نام دو اور پھر شوق سے سولی پر چڑھا دو۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کا پیغام ایمان و امن قبول ہو اور وہ سارے معاملات کی بنیاد بنے۔ جبکہ مغرب یہ چاہتا ہے کہ آپ اسلام کا ٹائٹل استعمال کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں، مگر روح اور مواد سارا مغرب سے لیں۔ لیکن ہم کسی دائرے میں بھی مغرب کی اس جبری ہدایت (Dictation) کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ پھر مغرب یہ بھی چاہتا ہے کہ عالم اسلام میں اس کی پشت پناہ آمریتوں، نام نہاد جمہوریتوں اور بادشاہتوں کو ظلِ الٰہی کے طور پر تسلیم کیا جائے، مگر ہم واضح طور پر کہتے ہیں کہ ہم اس کے لیے بھی کسی طور پر تیار نہیں۔ ہمارے اس موقف کے جواب میں مغرب نے صلیبی نفرت کو نیا لبادہ پہنا کر "بنیاد پرستی" کی گالی کی شکل دے دی ہے۔

مسلم سوسائٹی کا انحطاط اور اسلامی تحریک

سوال: قریب ترین تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اسلامی راسخ العقیدہ یا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مغرب کی اصطلاح میں "بنیاد پرست" لوگوں کی جتنی بھی تحریکیں ہیں، وہ ایک سطح تک اپنی تحریک کو کامیابی تک پہنچاتی ہیں، مگر اس کے بعد مسلم قوم پرست بلکہ صحیح معنوں میں سیکولر گروہ اس پر قابض اور حاوی ہو جاتے ہیں. بیسویں صدی کی جدید تاریخ ہمارے سامنے ہے. کیا اسلامی تحریکیں ہمیشہ مغرب پسند مسلم قوم پرستوں کے لیے ایک ثانوی کردار ہی ادا کرتی رہیں گی؟

جواب: یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ اس وقت مسلم سوسائٹی کی صورت حال یہ ہے کہ مختلف وجوہ سے مغربی اقوام کے ہاتھوں سیاسی شکست نے اس کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ میری نگاہ میں قومی زوال کا آغاز سیاسی شکست سے منسوب نہیں ہوا کرتا۔ شکست بلاشبہ ایک حد تک بری شے ہے، مگر زندگی کے مدوجزر کا ایک لازمی حصہ بھی ہے۔ البتہ شکست کو تسلیم کر کے بیٹھ جانا موت کے مترادف ہے۔ اس لیے یہ جاننا چاہیے کہ شکست مسلم سوسائٹی کے گوناں گوں تضادات کا ایک نتیجہ اور تسلسل ہے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر اسلامی تحریکات ایک بڑا ہی قابل قدر، تخلیقی اور ہمہ گیر شعور دینے کے باوجود ابھی تک مسلم سوسائٹی میں مکمل تبدیلی کا باعث نہیں بن سکیں۔ البتہ اس جدوجہد میں وہ پوری لگن کے ساتھ مصروف ہیں۔ میرے خیال میں اس صبر آزما اور وقت طلب عمل کا سبب یہ ہے کہ اسلامی تحریکات نے بڑے نامساعد حالات میں کام کا آغاز کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب علمی، فکری، ذہنی اور اخلاقی طور پر مغربی تہذیب نے مسلمانوں پر ہمہ گیر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ بگاڑ یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ مصر جیسے مسلمان ملک میں برطانوی اقتدار کے خلاف جنگ آزادی کے دوران رمضان کے مہینے میں عوام کے سامنے سعد زغلول شراب پیتا ہے، مگر پھر بھی لوگ اس کو زندہ باد کے نعروں سے ہی نوازتے ہیں! اسی طرح نیاز فتح پوری کو تمام تر ملحدانہ نظریات کے باوجود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ دلی میں ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ انہی حالات کے بارے میں اقبال نے کہا:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس پس منظر میں تحریک اسلامی نے دنیا بھر میں مختلف قیادتوں کے تحت مگر ایک واضح فکر کے ساتھ کام شروع کیا۔ ان کا کام دو پہلوؤں پر منحصر تھا: ایک فکری کہ انہیں باطل نظریات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے طلسم کو توڑنا تھا، تاکہ لوگوں کو اسلام کی حقانیت اور اسلام کے قابل عمل ہونے کا یقین حاصل ہو۔ اور بجا طور پر دوسری فکر ان کو یہ دامن گیر تھی کہ مسلم سوسائٹی کی اعلیٰ قیادت، جس میں دانش ور، اہل قلم، اساتذہ، اور اہل حل وعقد آتے ہیں اس کو مخاطب کیا جائے۔ لیکن میرے خیال میں شاید ہم اس امر کا اندازہ نہ لگا سکے کہ ملک میں قیادت اور عوام کے درمیان تعلقات کار تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم ایک تبدیل شدہ صورت حال میں تھے۔ جتنا بھرپور چیلنج درپیش تھا، اس میں بہرحال جان جوکھم، جدوجہد، ایثار اور قربانی پر اسلامی تحریکوں کو کریڈٹ پیش کرتا ہوں کہ جو کام انہوں نے کیا وہ بڑا بنیادی اور غیر معمولی کام تھا۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا وجہ ہے کہ اس کے بعد پھر وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکی جس کے نتیجے کے طور پر مقابل کی ساری قوتوں کو قائل کر کے ساتھ چلا لیتے۔

یہ مثال اپنی جگہ غور وفکر کی دعوت دیتی ہے کہ اگر حضرت ابوذر غفاری اسلام قبول کرتے ہیں تو پورا قبیلہ ان کے ساتھ آجاتا ہے۔ اگر طائف کے سردار اسلام قبول کر لیتے ہیں تو پورا طائف محسن عالم ﷺ کی اطاعت قبول کر لیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تو بلاشبہ آپ کے ساتھ آجاتے ہیں، مگر جمعیت العلمائے ہند نہیں آتی۔ اس اعتبار سے سیاسی و سماجی قیادت اور فکری قیادت: اسلامی تحریکات ان دونوں سے آگے بڑھنے میں فیصلہ کن حد تک کامیاب نہیں رہیں۔ ابھی تک وہ اس کی Transformation کو مکمل نہیں کر سکیں۔ یہی چیز ایک دوراہا ہے کہ جس پر ہمارے عوام دل سے اسلام چاہتے ہیں لیکن نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور نہ اخلاقی طور پر اس بات کے لیے تیار ہو سکے ہیں کہ اسلام جو مطالبات ان سے کرتا ہے اور جو تبدیلیاں وہ چاہتا ہے، انھیں اپنی زندگیوں میں لے آئیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا اصل بحران یہ ہے کہ بلاشبہ آج کا مسلمان اسلام کے لیے جان اور مال کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے، لیکن اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ سود کھانے سے تو نہیں شرماتے، مگر سؤر کھانے سے ضرور نفرت کرتے ہیں۔ اسلامی تحریکوں کے لیے یہ ایک کھلا چیلنج اور گھمبیر سوال ضرور ہے۔

سوال: ہمارے یہاں اسلامی تحریکیں خواص کے دلوں کو اس انقلابی دعوت کی طرف نہیں پھیر سکیں. کیا اسلامی تحریکوں کی حکمت عملی میں کوئی خامی رہ گئی ہے؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب: میں نے اس طرف ابھی اشارہ کیا ہے۔ اس وقت ہمارا سوسائٹی کا جو پاور سٹرکچر ہے اس کو ہم نہ تو اسلام کے حقیقی تصور اور تقاضوں پر عمل درآمد کے لیے قائل کر سکے ہیں اور نہ اسے ہلا سکے ہیں اور نہ اس کی رکاوٹ کو پوری طرح عبور کر سکے ہیں۔ چنانچہ یہی ہمارے لیے بڑا چیلنج ہے۔ ہم نے چاہا تھا کہ انتخابی عمل سے ایک ایسی حیثیت اختیار کر لیں، جس میں ہم لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکیں۔ لیکن محسوس ہوا کہ اسلامی قوتوں (اسلامی تحریکوں کا نہیں) کا تقسیم در تقسیم ہونا بلکہ متحارب ہونا، اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہے۔ ہم ان تجربات اور تلخ حقائق سے سیکھ رہے ہیں۔ اسلامی تحریک کو یہ جمود توڑنے کے لیے مستقبل میں زیادہ Populist (مقبول عام) پالیسی اختیار کرنا پڑے گی، جس کے معنی عوام کو متحرک اور بیدار کرنا ہے۔ اس بھرپور کاوش سے پاور سٹرکچر کو تبدیل کرنے کا عمل تیز ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس جدوجہد کے ابتدائی مرحلے میں عوامی سطح پر متوقع ابلاغ نہ ہو سکے، لیکن اگر ہدف واضح رہے اور تنظیم میں مضبوطی رہے تو پھر جہد مسلسل کے نتیجے میں ان شاء اللہ ضرور تبدیلی آئے گی۔

سوال: اسلامی تحریکوں نے خلیج میں جنگ ۱۹۹۱ء کے دوران جو نقطۂ نظر اختیار کیا تھا کیا وہ اسی مقبول عام پالیسی اپنانے کے تقاضے کے تحت تھا؟

جواب: اس پالیسی کو آپ اسلامی تحریکات کے مجموعی ہدف سے مکمل طور پر علیحدہ نہیں کر سکتے۔ لیکن جس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ عراقی صدر صدام حسین کے معاملے میں مسلم عوام نے مجموعی طور پر جس رویے کا اظہار کیا ہے، اس کو عام طور پر دوستوں نے محض ایک پہلو سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ میری دیانت دارانہ رائے میں مسلم عوام کا ردعمل، صدام حسین سے کسی محبت یا اس سے کسی اچھی توقع کی بنیاد پر نہیں تھا، بلکہ وہ حجاز مقدس کے آس پاس امریکہ کی قیادت میں ہونے والی مداخلت، اس کے اثرات اور اس علاقے پر مغرب کے سیاسی اور ثقافتی غلبے پر اپنی نفرت کے برملا اظہار کے لیے تھا۔ بلاشبہ وقتی طور پر صدر صدام اس مزاحمت کا Symbol (علامت) بن گیا اور کچھ لوگوں نے سادہ لوحی میں اسے یہ معنی دیے کہ گویا یہ عوامی تحریک صدر صدام کی شخصی حمایت میں ہے۔ میں پھر اس نکتے پر زور دوں گا کہ وہ عوامی ردِ عمل صدام کی ذات کے لیے ہرگز ہرگز نہیں تھا۔

یہ چیز میرے اس نقطۂ نظر کو تقویت پہنچاتی ہے کہ اپنی ساری خامیوں کے باوجود مسلمان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عوام کے ذہن کمزور سہی، جذباتی اور Confused سہی، لیکن وہ کھلے کھلے اسلام اور کھلے کھلے کفر میں فرق سے واقفیت رکھتے ہیں اور حکمران طبقوں سے زیادہ اسلام اور مسلم امت کے مفاد کی تڑپ رکھتے ہیں۔ یہ نسلی اور ان پڑھ مسلمان، کفر کے غلبے اور اسلام کے غلبے کو ایک دوسرے سے متضاد سمجھتے ہیں۔ یہ اسلام کے غلبے کے خواہش مند ہیں اور کفر کے غلبے سے نفرت کرتے ہیں۔ اس تناظر میں عوام کے جذبات کو سامنے رکھنا یا عوام کے جذبات اور اسلامی تحریکات کی سوچ میں مطابقت کا پیدا ہونا ایک فطری اور صحیح مظہر ہے۔ اس بحران اور عوامی ردعمل کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی سامنے رہے کہ صدام حسین اور اس جیسے لیڈروں کے بارے میں خود مغربی اور عرب دنیا کے حکمرانوں کا رویہ بھی بدلتا رہا ہے۔ اسلامی تحریکات عراق کی بعث لیڈرشپ کی اصولی مخالفت اس وقت سے کر رہی ہیں، جب عرب دنیا میں "بعث" قیادتیں ابھریں۔ لیکن وہ صدام حسین ہو یا حافظ الاسد، مختلف عرب قیادتیں ان کو اپنا دوست بناتی رہیں اور مفاد کی اس جنگ میں ان کی دوستیاں اور دشمنیاں بدلتی رہیں۔ کل انہی قیادتوں نے صدام کو مضبوط کیا اور آج حافظ الاسد کا سہارا بنی ہوئی ہیں۔ اسلامی تحریکات نے تو دونوں ہی کے ہاتھوں زخم کھائے ہیں اور ان میں سے کسی سے بھی ہم اچھی اُمید نہیں رکھتے۔ خلیج کی جنگ کے دوران میں اصل مسئلہ کسی شخصیت کا نہ تھا یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکوں نے صاف، واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کویت پر صدام کی جارحیت کی کھلی مذمت کی اور کویت کی آزادی اور بحالی کا مطالبہ کیا۔ البتہ ان کی اصل مخالفت امریکہ کے اس "نئے عالمی نظام" (New World Order) کے خلاف تھی، جس نے اس لڑائی کو ایک تہذیبی اور سیاسی جہت دے دی تھی۔

ایران اور اسلامی انقلاب

سوال: دور حاضر میں اسلام کی تحریکوں کا ایک کامیاب انقلاب ایران میں امام خمینی کی قیادت میں برپا ہوا. خمینی صاحب کی حکمت عملی کے برعکس مولانا مودودی نے ماچھی گوٹھ کے اجتماع ۱۹۵۷ء میں جو پارلیمانی انتخابی پالیسی اختیار کی تھی وہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کیا ناکام نہیں ہو گئی؟ جب کہ امام خمینی نے تو کم عرصے میں اپنا ہدف حاصل کر لیا؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب: یہ موازنہ حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔ بلاشبہ امام خمینی نے جو تحریک اختیار کی وہ زیادہ مقبول عام تھی اور اس تحریک میں عوام کا حصہ بہت زیادہ تھا۔ لیکن یہ امر واضح رہے کہ یہ ایسی کوشش نہیں تھی کہ جس میں آپ brick by brick (اینٹ در اینٹ) کوئی چیز تعمیر کریں، بلکہ اس کی حیثیت اس طوفان اور ریلے کی سی تھی، جو اگر صحیح وقت میں برپا ہو جائے تو تعمیر کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے اور اگر ذرا سی غلطی ہو جائے تو تخریب کے لیے بھی کردار ادا کر سکتا ہے اور خود اس کے علم برداروں پر پلٹ سکتا ہے۔ پہلوی بادشاہت اور امریکی اثرات کے تابع ایران کے حالات کے ساتھ ساتھ سب سے اہم بات یہ ذہن میں رکھیے کہ وہاں شیعہ مذہب ایک منظم قوت ہے، جس میں اطاعت اور رہنمائی کا مرکز "قم" تھا اور ہے۔ "قم" سے پروان چڑھنے والا یہ تنظیمی ڈھانچہ بڑا گہرا، مربوط اور حکومت کی گرفت سے آزاد اور خود مختار ہے۔ اس کے پاس صرف مذہبی قوت نہیں ہے بلکہ مالی قوت بھی ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انقلاب کی ایک نفسیات ہوتی ہے۔ انقلابات کی نفسیات کا آپ مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ظلم جتنا شدید ہوتا ہے، رد عمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ "سائیکالوجی آف ریولیوشن" کے اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ایران کی صورت حال بڑی منفرد نوعیت کی تھی۔ وہاں تشدد، ظلم، آمریت، خفیہ سروس کا جتنا ہوش ربا نظام تھا اور جس وسیع پیمانے پر لوگوں کو گرفتار کر کے خاندانوں کے خاندانوں کو برباد کر دیا گیا تھا، اس کے خلاف نفرت اور گھٹن اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ امام خمینی نے ان حالات میں صحیح وقت پر اقدام کیا۔ ان کے پاس مشینری موجود تھی جس کے ذریعے وہ اسے صحیح وقت پر استعمال کر سکے۔

تیسری بات جس سے شاید کچھ لوگ متفق نہ ہوں، لیکن بہرحال میں اپنی دیانتدارانہ رائے کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مختلف وجوہ کی بنا پر ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ خود امریکہ بھی ایرانی بادشاہ رضا شاہ پہلوی سے اکتا سا گیا تھا۔ اس ضمن میں شاہ کی جانب سے تیل کے خود مختارانہ استعمال نے بھی اپنا رنگ دکھایا، ساتھ ہی ساتھ ڈھائی ہزار سالہ جشن بادشاہت جہاں ایک طرف اس کا نقطۂ عروج تھی تو دوسری طرف زوال کا نقطۂ آغاز بھی ٹھہری۔

سوال: کیا روح اللہ خمینی تحریک سے ابتداء میں امریکی خوش تھے؟

جواب: اس ضمن میں امریکہ کا معاملہ عجیب و غریب رہا ہے۔ امریکہ نے پہلے تو شاہ ایران

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو ہر طرح سے مضبوط بنانے کی کوشش کی، تاکہ ایران اور اسرائیل دونوں مل کر اس علاقے میں امریکہ کے سیاسی، دفاعی اور معاشی مفادات کی تکمیل کر سکیں۔ اس خدمت کی انجام دہی کے عوض شاہ ایران نے اپنے اقتدار کو استحکام بخشنے کے لیے پوری پوری قیمت وصول کرنا شروع کی۔ کچھ ہی عرصے بعد شاہ ایران نے اپنی بحریہ، فضائیہ اور بری افواج کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ اسے اعلیٰ درجے کے اسلحے سے لیس کرنا شروع کیا، تاکہ علاقائی قوت کے طور پر اپنی آزادانہ مرضی سے پیش رفت کرے۔ اس ضمن میں شاہ ایران نے افغانستان، پاکستان، عراق وغیرہ سے بھی سلسلہ جنبانی شروع کیا۔ شاہ ایران کے رفتہ رفتہ ظاہر ہونے والے ان عزائم پر امریکہ کا ماتھا ٹھنکا۔ تب ماضی کے برعکس اس نے ایران میں "بنیادی انسانی حقوق" کے مسئلے کو اٹھانا شروع کیا۔ شاہ ایران کے دورہ امریکہ کے موقع پر بھی یہ ایک پس پردہ محرک تھا۔ واضح رہے کہ امریکہ کی یہ حکمت عملی امام خمینی کو برسر اقتدار لانے کے لیے نہیں تھی، بلکہ محض شاہ پر دباؤ ڈالنے، دھمکانے، امریکی مرضی کے تابع رکھنے اور آخر کار ایرانی فوجی انقلاب کے لیے تھی۔ لیکن امام خمینی کی قیادت میں انقلاب کی تیز لہر نہ صرف شاہ کو بہا لے گئی، بلکہ خود امریکی مفادات کو سہارا دینے والا لنگر بھی ٹوٹ گیا۔ دوسرے لفظوں میں خمینی تحریک کی ابلاغی سطح پر تشہیر کے ذریعے شاہ کو دبانا تو امریکی پالیسی کا حصہ تھا، مگر خمینی کو لانا امریکی پالیسی میں نہیں تھا، بہرحال یہ ظاہر ہے کہ نتیجہ ان کے اندازوں کے برعکس ظاہر ہوا۔ شاہ کے خلاف تحریک کے دوران امام خمینی سے ملنے کے لیے میں خود فرانس گیا تھا۔ اس انقلاب کی پوری دنیا کی فضا بنانے کے لیے فرانس میں ذرائع ابلاغ نے جو کردار ادا کیا ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جو صورت حال انقلاب کے لیے وہاں پیدا ہوئی، اس کو پیدا کرنے میں یہ عوامل سامنے رکھنے پڑیں گے۔ یہ ایک منفرد نوعیت کا معاملہ تھا۔ ان چیزوں کا عمل اور ردعمل جس طریقے سے ایران میں ۷۹-۱۹۷۸ء کے دوران ہوا ہے، وہ پاکستان میں موجود نہیں۔ اس لیے اس کا دوسروں سے موازنہ کر کے یہ کہنا کہ فلاں حکمت عملی کامیاب ہو گئی اور فلاں ناکام، نہ صرف جذباتی رویہ ہے بلکہ علمی اور عملی دونوں اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔

جہاں تک جماعت اسلامی کی ماچھی گوٹھ میں طے کی جانے والی حکمت عملی کا تعلق ہے (یہ پالیسی مولانا مودودی کی تقریر "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" میں پوری وضاحت سے دیکھی جا سکتی ہے) اسی پر جماعت اسلامی ابھی تک عمل کر رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ پالیسی ناکام ہو گئی ہو اور ۱۹۸۵ء کے بعد ہم نے کوئی نئی حکمت عملی بنالی ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکمت عملی وہی ہے کہ ہمیں چار میدانوں میں کام کرنا ہے یعنی فکری اور نظریاتی دعوت، اخلاقی اصلاح اور تنظیم، معاشرہ کی اخلاقی بنیادوں پر تشکیل نو اور سیاسی نظام کی اصلاح اور نئی قیادت کو بروئے کار لانے کی جدوجہد۔ یہ پورا کام ایک دوسرے سے مربوط اور اس پر منحصر ہے۔ ہم جس حد تک اولین تین میدانوں یعنی فکری تعمیر و تشکیل، تنظیمی قوت کا حصول اور اسلامی معاشرے میں کامیابی حاصل کریں گے اسی قدر ہمیں سیاسی حیثیت سے اقدام کرنے اور آگے بڑھنے کے کام کرنے ہوں گے۔ ۱۹۷۰ء کی انتخابی ناکامی میں بڑی وجوہ یہ تھیں کہ اسلامی قوتیں تقسیم تھیں، بلاشبہ انہیں مجموعی طور پر زیادہ ووٹ ملے، لیکن وہ مجتمع سیاسی قوت حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کا دور پاکستان کی سیاسی زندگی میں ایک بڑا نازک زمانہ ہے۔ اس عہد میں طوفان کی طرح کچھ عصبیتیں ابھریں، جن میں علاقائیت اور معاشی وجوہ سے طبقہ واریت اور سماجی نفرت شامل تھی۔ میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ تحریک اسلامی نہ توان کا توڑ کر سکی اور نہ اس صورت حال کے پیش نظر پروگرام وضع کر سکی۔ اُن انتخابات میں ہم اپنی حکمت عملی اور برسرزمین موجود معروضی سیاسی و معاشی حقائق میں مطابقت پیدا نہیں کر سکے اور اس وجہ سے مطلوبہ نتائج رونما نہ ہو سکے۔

اس ضمن میں ادراک اور ردِ عمل یا قبولیت دونوں کی کمی رہی۔ میں اپنے آپ کو بھی اس میں برابر کا ذمہ دار سمجھتا ہوں، چاہے میں ملک میں اس وقت موجود نہیں تھا، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اس عہد میں یہ ایک خلا تھا، جسے ہم بروقت پر نہیں کر سکے۔

سوال: ایک یہ بات بھی ہے کہ ایران یک لسانی اور ایک غالب نسلی معاشرہ ہے۔ جبکہ پاکستان کثیر لسانی اور مخلوط قومی معاشرہ ہے۔ میرے تجزیئے کے مطابق یہاں علامہ اقبال کی فکر اور مولانا مودودی کی زیر قیادت تحریک اسلامی کی اپیل پنجاب اور یو، پی سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں زیادہ مقبول ہوئی، جبکہ سرحد میں اس سے کم مقبول ہوئی اور پھر سندھ میں سندھی بولنے والوں میں تو اس سے بھی کم۔ اس طرح تحریک اسلامی کے حق میں قومی سطح پر جذبۂ قبولیت نہیں ابھرا۔ کیا ایران کے مقابلے میں نسلی اور لسانی مضمرات بھی پاکستان کی تحریک اسلامی کی راہ میں بڑی رکاوٹ نہیں ہیں؟

جواب: ان چیزوں کے مضمرات تو بلاشبہ کارفرما ہیں، لیکن میں ان کو غالب اسباب نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھتا۔ یہ بات نہیں ہے پاکستان میں اردو بولنے والے اور پنجابی بولنے والے تو اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں مگر بنگالی، سندھی، بلوچی، بروہی اور پشتو بولنے والے نہیں چاہتے۔ ایک خاص سطح تک ان تمام لسانی گروپوں میں کم و بیش ایک جیسا ہی اسلام کا تعلق ہے اور وہ عرب و عجم کی دیگر مسلمانوں قوموں سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ جہاں تک اس مفروضے کا تعلق ہے کہ ایران میں اس لیے انقلاب آگیا کہ وہ یک لسانی ملک ہے تو میرے خیال میں اس انقلاب کے احوال و ظروف میں اس کو بڑا سبب قرار دینا درست نہیں۔ ایران میں بھی آپ کو ایرانی نسل کے افراد ملیں گے، عرب بھی ملیں گے اور کُرد اور بلوچ بھی ملیں گے۔ آپ کو شیعہ آبادی کے ساتھ ساتھ قابل لحاظ تعداد میں سنی العقیدہ بھی ملیں گے۔

سوال: غالباً پچاسی فیصد ایرانی تو شیعہ ہیں؟

جواب: ہماری معلومات کے مطابق وہاں ۳۰ فیصد سے زیادہ سنی ہیں اور ۷۰ فیصد یا اس سے کچھ کم شیعہ ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہاں مکمل فقہی ہم آہنگی ہے۔ جس فضا کا تذکرہ میں نے اوپر کیا ہے ایسی فضا میں آئیڈیالوجی کو تنظیمی ڈھانچہ مل جائے اور عوامی قوت کو متحرک کر لیا جائے تو متحارب اور متضاد عوامل ایک نظم میں آجاتے ہیں۔ تحریک پاکستان اس کی نمایاں ترین مثال ہے جس میں سب لسانی اور نسلی گروہ تمام مذہبی مسلکوں کے پیروکار شریک ہوئے اور انہوں نے ایک اجتماعی نصب العین حاصل کر لیا۔

ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد تحریک پاکستان اور اس کے تقاضا کو نظر انداز کر دیا گیا اور بدقسمتی سے ملک آزادی کے فوراً ہی بعد قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت سے محروم ہو گیا۔ قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصے بعد یہاں کے انتظامی، سیاسی اور ابلاغی ڈھانچے میں اسلام کو بنیادی نظریے کے طور پر قبول کرنے سے گریز کی تحریک لائی گئی جو برابر بڑھتی گئی اور اس طرح ملک نئے فتنوں میں مبتلا ہو گیا۔

تحریک پاکستان اور پاکستان کا نظریاتی بحران

سوال: قیام پاکستان کے بعد "قراردادِ مقاصد" بھی تو منظور ہوئی تھی؟

جواب: میرا زور عملی پالیسی پر ہے۔ آپ دیکھیں تو پہلا ہدف اسلام اور پاکستانی قومیت تھا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن منظم کوشش کے ذریعے لسانی (Ethnic) نسلی (Racial) صوبائی (Provincial) عصبیتوں کو حکومتی ایوانوں اور سرکاری اداروں ہی نے پروان چڑھایا اور مختلف عناصر نے جو غالب تعداد میں اشتراکی اور سیکولر فکر کے حامل تھے، انہوں نے ہیئت مقتدرہ کی اس ضمن میں باقاعدہ مدد کی۔ قائداعظم کی واحد ذات اس کے سامنے سینہ سپر تھی مگر حصول پاکستان کے بعد ان کی آنکھیں بند کرتے ہی خود ان کے دست و بازو تماشائی بن گئے، یا ان کی امنگوں کے خلاف چل نکلے۔ میرے نزدیک یہ اسلام اور پاکستان سے بغاوت کی عملی کوشش تھی۔ ان عصبیتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی متبادل قوت پھلنے پھولنے نہیں دی گئی اور "قرارداد مقاصد" کی منظوری بذات خود تحریک پاکستان کے تسلسل اور قیام پاکستان کے ثمرات کی دستاویزی تشکیل تھی۔

جہاں تک آپ نے علامہ اقبال کی بات کہی ہے میں بربنائے علم یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کا اثر تقسیم سے پہلے تک سندھ میں، بہار میں، بنگال میں یا دکن میں اس سے کچھ کم نہیں تھا، جتنا کہ پنجاب میں تھا۔ علامہ محمد اقبال کا پیغام ایک قوتِ متحرکہ کے طور پر مسلمانوں کو ابھارنے میں اپنا کردار ادا کرتا رہا ہے اور کرے گا۔

سوال: کیا واقعی؟ خاص طور پر مسلم اکثریتی علاقوں، سرحد، سندھ اور بنگال کے حوالے سے؟

جواب: جی ہاں، یہ بات میں علامہ محمد اقبال کے حوالے سے کسی پراپیگنڈے کے زیر اثر یا خوش عقیدگی کی بناء پر نہیں بلکہ پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ مثلاً سندھ کے بارے میں جی ایم سید صاحب کا وہ خطبہ اٹھا کر پڑھ لیں جو ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں موصوف نے پڑھا ہے اور جس میں آج کے اس سیکولر اور سندھی قوم پرست لیڈر نے اقبال کی فکر اور پیغام میں شامل تمام چیزوں کا حوالہ دیا ہے۔ "خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی" جیسے خوبصورت اشعار سے یہ خطبہ مزین ہے اور یہ کہ "ہم اگر بچ سکتے ہیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں تو صرف اس وقت جب کہ پورے برصغیر سے مسلمان یہاں آ کر ہماری معاشی ترقی میں ہاتھ بٹائیں اور ہمیں ہندوؤں کے تسلط سے نجات دلائیں۔"

سوال: جی ایم سید کے یہ اپنے خیالات تھے یا آل انڈیا مسلم لیگ کا کوئی فیڈ بیک تھا؟

جواب: بالکل نہیں، یہ نہ صرف جی ایم سید صاحب کے اپنے خیالات تھے، بلکہ یہ سندھ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے مسلمانوں کے خیالات تھے اور یہ بات ۱۹۴۳ء کی ہے۔ اس دور کے بہت سے سندھی دانش وروں نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے برعکس یہ سارے کا سارا رجعت قہقری اور انقلاب معکوس دراصل پاکستان بننے کے بعد ہوا اور اس میں مہاجر و پنجابی سیاسی قیادت اور انہی پر مشتمل بیوروکریسی کی کھلی کھلی ناکامی ہے۔ اس بناء پر میں اب بھی اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ پاکستان کے مسلمانوں میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ان کے سامنے اگر اسلام کو محض ایک نعرے کے طور پر نہیں، بلکہ اسلام کو ان کے سامنے زندگی کے ایک پروگرام کے طور پر پیش کیا جائے، جس میں انصاف، آزادی اور معاشی حقوق کا تحفظ مل سکے اور کوئی مخلص قیادت گروہی و ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر عوام کا اعتماد حاصل کر لے تو ان کو وہ منصفانہ اور عادلانہ راہ عمل دی جا سکتی ہے، جس کے اندر یہ قومیتیں باوقار انداز سے اپنا برادرانہ کردار ادا کر سکتی ہیں اور پنپ بھی سکتی ہیں۔

میں نے جہاں تک قومیتوں کے بارے میں اسلام کا مطالعہ کیا ہے، اسلام نے قومیت کے وجود سے انکار نہیں کیا، بلکہ اسے ایک بالاتر وفاداری سے منسوب، مربوط اور متحرک کیا ہے۔ اس کی ایک کلاسیکل مثال یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے اپنی فوج کو تربیت دیتے ہوئے ہر قبیلے کو ایک مقام دیا، اس قبیلے کے سردار کو جھنڈا دیا اور ارشاد فرمایا "چونکہ تم اپنی روایات جانتے ہو، اس لیے انہی روایات کے مطابق تمہیں یہ مقام دیا ہے، مگر قبیلے کی عظمت کے لیے نہیں۔" آپ ﷺ نے یہ عمل پیش کیا لیکن یہاں پر یہ نہیں کیا گیا، بلکہ یہاں پر ان حقوق کی بات کرنے والے کو اسلامی اور پاکستان کا دشمن سمجھ لیا گیا۔ ہمارے پاس تو اسلام میں علاقائی ترقی کی پوری تاریخ ہے، مگر پاکستان میں اس کو نہیں اپنایا۔ جب تک ہم قومیتوں کو اللہ اور اس کے رسول سے منسوب ایک بالاتر وفاداری کے دائرے میں نہیں لائیں گے تو ایسے بحران آتے رہیں گے۔

ہم سب اسی پہلو پر سوچ رہے ہیں اور یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ نہ ہم پچھلے تسلسل اور عمل کو ترک کر رہے ہیں اور نہ غور و فکر کی راہ پر چل کر ماضی کی روایت ہی سے انحراف کر رہے ہیں۔

سوال: ہم دیکھتے کہ دینی اور اسلامی تحریکیں جو بالاخر مسلم قوم پرستوں کے غلبے میں تحلیل ہوئیں یا مقتدی بن کر رہ گئیں۔ کشمیر، فلسطین، افغانستان، پاکستان اور الجزائر وغیرہ میں یہی ہوتا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دکھائی دے رہا ہے۔ اس پر کیا سوچا گیا ہے؟

جواب: اس بات سے مجھے اتفاق ہے کہ یہ سانحہ بار بار ہوا ہے کہ عوام نے اسلام کے نام پر قربانیاں دیں، لیکن آزادی حاصل ہوئی تو پھل دوسروں نے اچک لیا اور قربانی دینے والوں کی امنگوں کے مطابق اجتماعی زندگی کی صورت گری نہ ہو سکی۔ تقریباً ہر ملک میں پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کے دوران میں یہی ہوا ہے اور اس کی بڑی مثال آپ کو پاکستان کے علاوہ الجزائر میں مل چکی ہے۔ اگرچہ تقریباً اٹھائیس برس بعد صورت حال میں تبدیلی آئی ہے، لیکن قرائن و شواہد سے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔ یہ دیکھیے کہ اس وقت اسلامی تحریکات ان تمام مقامات پر یعنی الجزائر، سوڈان، یمن، مصر، ترکی، بنگلہ دیش، افغانستان، فلسطین، کشمیر یا پاکستان، ہر جگہ وہ اپنی عمومی مقبولیت کی بنیاد کو وسیع اور مضبوط کر رہی ہیں۔ وہ اتحادی حکمت عملی (الائنس سٹریٹجی) بھی استعمال کر رہی ہیں، جس میں سارے دینی عناصر کو مجتمع کرنے کی کوشش اور جستجو ہے اور دوسری طرف اپنے پروگرام کو اس طرح وسیع کر رہی ہیں کہ ان میں ملک کے سبھی مخلص لوگوں کے لیے جگہ پیدا ہو سکے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اسلامی تحریکیں عوام کے جذبات اور مسائل کا پہلے سے زیادہ بہتر ادراک پیش کر رہی ہیں اور اس عمل سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ مستقبل بہتر ہو گا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری مخالف قوتیں پہلے سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ سرگرم عمل ہیں اور ان کی پشت پناہی کرنے والے بھی پہلے کی طرح صف بستہ موجود ہیں۔ یہود و ہنود اور نصرانیت کا اتحاد تو سرحدوں سے بالاتر تھا ہی، مگر ان کے ساز میں آواز ملانے اور محض ذاتی ترقی کے خواب دیکھنے والے کچھ سادہ لوح اور مغرب زدہ مسلمان بھی شامل ہیں۔

سوال: بلاشبہ ان لوگوں کے پاس وسائل بھی زیادہ ہیں اور دینی فکر و عمل کے خلاف ردعمل کے فوری اور موثر ذرائع بھی ہیں؟

جواب: جی ہاں! اور ہم اپنے مخالفین کی قوت کا غلط اندازہ نہیں لگا رہے اور اپنی صلاحیت کے بارے میں بھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہیں۔ ماضی کی نسبت آج ہماری سمت پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہے۔ مگر بہت کچھ کرنا باقی ہے، یہ سیکھنے سکھانے اور منظم کرنے کا عمل ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جنگِ خلیج اور اسلامی تحریکیں

سوال: اسلامی تحریکوں نے ہمیشہ اصولی مؤقف اختیار کیا، لیکن کویت عراق مناقشے (۹۱-۱۹۹۲ء) میں، اپنی حکومتوں کے مؤقف اور اصول پسندی کے برعکس وہ جارح ملک عراق کی حمایت میں چل پڑیں، جس کے نتیجے میں ان کی اصول پسندانہ روایت کو شدید صدمہ پہنچا اور جواب میں امریکہ نے ان کے جائز مسائل مثلاً کشمیر، فلسطین، افغانستان اور بوسنیا وغیرہ میں ان کا ساتھ نہیں دیا، بلکہ الٹا نقصان پہنچایا۔ میرے خیال میں اسلامی تحریکوں کے اخلاقی مقام و مرتبے کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ بھی اس نقصان کا ایک محرک ہے؟

جواب: اس تلخ تبصرے میں اپنے ذاتی احساسات کی آمیزش کو تاریخ کا فیصلہ قرار دینا نامناسب ہی نہیں بلکہ یک رخا پن بھی ہے۔ تاریخ واقعات کے پس منظر میں ابھرنے والے حقائق کا نام ہے، جسے محدود اخباری کینوس پر رکھ کر پرکھنا موزوں نہیں ہوگا۔ اس ضمن میں جو اصولی مؤقف آپ بیان کر رہے ہیں، اسلامی تحریکوں نے اس بارے میں کیا مؤقف اختیار کیا اور کیا نہیں اختیار کیا؟ اسے تو میں بعد میں لوں گا، پہلے ذرا یہ دیکھیے کہ کچھ لوگوں اور حکومتوں نے آپ کے خیال میں کون سا درست اصولی مؤقف اختیار کیا۔

سوال: میرا مطلب ہے کہ اسلامی تحریکوں کو درست اصولی مؤقف اختیار کرنا چاہیے تھا؟

جواب: آپ اسے ملحوظ رکھیے کہ آپ کے بقول "درست اصولی مؤقف" ترکی، ملائشیا، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، مصر اور پاکستان وغیرہ کی حکومت نے بھی اختیار کیا۔ ان کے برعکس صرف یمن، سوڈان، الجزائر، تحریک آزادی فلسطین ان چار ممالک کو چھوڑ کر ایران سمیت سب نے وہی درست اصولی مؤقف اختیار کیا۔ ان سب میں ایران ایک نظریاتی ملک تھا، لیکن آپ دیکھیے کہ مسلم ریاستوں کی بھرپور اکثریت کی ہم نوائی کے باوجود فلسطین کے بارے میں امریکہ کی سوچ میں کوئی نرم گوشہ یا منصفانہ نکتہ نظر پیدا ہوا؟ کشمیر کے بارے میں امریکہ یا اس کی اتحادی قوتوں کے مؤقف میں کوئی فرق پڑا؟ اور اب بوسنیا؟ دنیا کے دوسرے ملکوں میں ہونے والے ظلم کے خلاف اقوام متحدہ نے کوئی "انقلابی" قدم اٹھایا؟ اس سارے منظر نامے میں بے چاری اسلامی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تحریکیں تو بہت چھوٹی سی چیز تھیں۔ لیکن جنہوں نے اس "اصولی اقدام" کا ساتھ دیا اور اسی دعوے کے ساتھ دیا کہ "وہ اصول کی حکمرانی لا رہے ہیں"۔ انہوں نے اقوام عالم اور مغربی طاقتوں کی بے حسی کو کس حد تک احساس و شعور عطا کیا؟۔

آپ اقوام متحدہ کی کارروائی کو اگر سمجھنا چاہتے ہیں تو کچھ اعلان شدہ دستاویزات موجود ہیں، جن میں کہا گیا کہ "یہ جنگ اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت ہوئی ہے اور یہ اس کی امن کوششیں ہیں"۔ اور ریکارڈ پر یہ بھی موجود ہے کہ مسئلے کے حل میں جتنا عدم تعاون کا رویہ عراقی صدر صدام حسین کا تھا، اتنا ہی عدم تعاون کا رویہ امریکہ کا بھی تھا۔ امن کی کوششوں میں امریکہ کا رویہ کھلی اور چھپی منافقت پر مبنی تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ دانش ورانہ لہجے کے ساتھ "امریکہ بہادر" کو عراق کویت قضیئے میں اخلاقی ہیرو کے طور پر پیش کرنا دنیا کے بے رحم سیاسی حقائق کی صحیح عکاسی نہیں ہے۔ یہ ایک "گیم آف پالیٹیکس" تھی، جس میں امریکہ خاص مقام حاصل کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف صدام حسین ایک خاص پوزیشن حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دونوں نے زور لگایا صدام ناکام رہا اور امریکہ کامیاب ہوا، مگر اس کے باوجود یہ مسئلے کی صرف ایک جہت ہے۔

سوال: اور یہ جو عراق نے قبضہ کر لیا تھا کویت پر؟

جواب: میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ جہاں تک اسلامی تحریکوں کے موقف کی اخلاقی بنیاد کا تعلق ہے، میں اس سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ لیکن یہاں پر یہ ضرور کھولوں گا کہ اس المیے کو تدریج اور پس منظر سے کاٹ کر دیکھنا حقائق کے خلاف ہوگا۔

۳ اگست ۱۹۹۰ء کو عراق کے کویت پر قبضے کی مذمت میں محترم قاضی حسین احمد صاحب نے بیان دیا، جو میں نے خود لندن میں جاری کیا۔ اسی طرح کا بیان اخوان المسلمون کے مرشد عام محترم حامد ابو نصر صاحب نے ۳ اگست ہی کو قاہرہ سے جاری کیا، ان دونوں بیانات میں عراق کے کویت پر حملے کی صاف صاف لفظوں میں مذمت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ "عراق کو کویت سے اپنی فوجیں واپس نکال لے جانی چاہئیں، اسے کویت پر قبضے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے۔ عراق کے اعتراضات اور شکایات ختم کرنے کے لیے یہ اقدام قطعی طور پر غلط ہے، سیاسی معاملات کو بات چیت سے حل کرنا چاہیے۔ —— "۳ اگست ۱۹۹۰ء سے لے کر ۹ اگست تک ہمارا کوئی ایسا بیان نہیں پیش کیا جا سکتا، جس میں کسی سطح پر بھی عراق کی ہم نوائی کا پہلو نکلتا ہو یا اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی جارحیت کو نظر انداز کیا گیا ہو۔

لیکن ۹ اگست کو جبکہ امریکہ نے اپنی فوجیں سعودی عرب میں اتارنا شروع کر دیں تو اس سے اگلے ہی دن ہم نے یہ بیان دیا کہ "عراق کا حملہ بہت بڑی حماقت تھا، لیکن امریکہ کی فوجوں کی آمد پورے علاقے کی سیاست کو بنیادی طور پر تبدیل کرتی ہے اور ان کو بلانا بھی بڑا غلط اقدام ہے۔ امریکی فوجوں کا آنا قطعی طور پر ناقابلِ قبول ہے اور ہم نے ان کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں"۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "عراق کو کویت سے اور امریکہ کو سعودی عرب سے بیک وقت اپنی فوجیں بُلا لینی چاہییں اور مسئلے کا اسلامی دنیا (OIC) کی سطح پر یا عربوں کی سطح پر حل نکالنا چاہیے، ضرورت ہو تو مسلمانوں کی امن فورس تشکیل دی جائے۔ اور مسلمانوں کی امن فورس ہی کو ان کے درمیان حائل ہونا چاہیے، امریکہ اور یورپ کی فوج کو نہیں ـــــ" یہ بات ہم نے ۹ اگست سے پندرہ جنوری ۱۹۹۱ء تک مختلف انداز میں اور تسلسل کے ساتھ کہی۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۱ء کو جب امریکی اتحادی فوجوں کا عراق پر حملہ ہو گیا، تو ہم نے کہا "اب صورت حال یہ ہے کہ اگر ایک مریض بخار میں مبتلا ہو اور اس کی نس پھٹ جائے تو پھر وقتی طور پر بخار کو نظر انداز کر کے اس خون کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہم نے اس وقت بھی عراق کے جارحانہ اقدام کی تائید نہیں کی اور بعد میں بھی نہیں کی۔ لیکن چونکہ اس وقت فوری چیز جنگ کو روکنا تھا، اس لیے اسلامی تحریکوں کے موقف کا یہ اہم ترین پہلو تھا۔ اب اس میں کسی لیڈر کے بیان و اظہار کا لہجہ غیر ہموار رہا ہو وہ الگ چیز ہے۔ لیکن ہمارا موقف سب سے زیادہ منصفانہ تھا اور ہم نے اس فریم ورک کو نظر انداز نہیں کیا۔

سوال: عراقی حملہ ۲ اگست کو ہوا. اس وقت قاہرہ میں اسلامی وزراء خارجہ کی کانفرنس ہو رہی تھی. جب یہ خبر آئی کہ کویت پر قبضہ ہو گیا ہے، تو عرب وزرائے خارجہ نے کہا کہ اس کے لیے ہم ایک الگ اجلاس کرتے ہیں جس میں ایک متفقہ موقف لائیں گے. چنانچہ اسلامی وزراء خارجہ کی کانفرنس نے اس تجویز کو تسلیم کر لیا. لہذا ان کی ایک علیحدہ نشست اگلے دن تک ہوتی رہی. ۳ تاریخ کو جب واپس آئے تو ۲۱ ملک ۱۲ اور ۹ میں تقسیم ہو گئے. جن میں بارہ ممالک عراق کی مخالفت کر رہے تھے اور نو میں کچھ تائید کر رہے تھے. اس طرح عرب اور اسلامی ممالک کی جانب سے حل کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امکانات ختم ہو گئے۔ اس کے بعد قومی سعودی ریاست کے طور پر اس کا استحقاق یہ تھا کہ وہ باہر سے فوجی مدد لے، کسی سے اتحاد کرے اور کسی بھی قوم، یا مذہب سے اپنے اتحادیوں کو پکارے۔ ۱۹۷۰ء میں جب پاکستان ٹوٹ رہا تھا تو ہم اہل پاکستان بھی تو امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ ہمیں آ کر بچائے؟

جواب: عرب دنیا کے حوالے سے یہ استدلال صحافتی خوش فہمی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

سوال: دسمبر ۱۹۷۰ء میں یہ بات پاکستانی حکومت کی طرف سے سامنے آئی تھی، جس میں یہ تاثر تھا کہ "امریکی Rescue کے لیے آئیں گے۔"

جواب: صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان کی طرف سے یہ دھوکے اور بیوقوفی کی بات تھی۔ اس بات کا کوئی موازنہ ۱۹۹۰ء میں امریکی اتحادیوں کی خلیج کے صحراؤں، پانیوں اور فضاؤں میں یلغار سے نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: میں اب اسلامی تحریکوں کی بات نہیں کر رہا۔ جب سعودی عرب حکومت نے ۳ اگست کو یہ دیکھا کہ اب عرب اور مسلم برادری کے ہاتھوں اس کا حل نہیں نکل رہا تو پھر انہوں نے دو طرفہ معاہدوں کے تحت فوج منگوا لی اور اس طرح اپنا تحفظ کر لیا اور اس کے نتیجے میں کویت نے آزادی حاصل کی۔ اب ان حالات میں بلاشبہ اسلامی تحریکیں سفارتی سطح پر کوئی بنیادی کردار تو ادا نہیں کر سکتی تھیں، لیکن وہ سعودی اور امریکی اتحادیوں کی جنگی کارروائیوں کی مسلسل شدید ترین الفاظ میں مذمت کر رہی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جنگ سے زیادہ ایک اخلاقی مسئلہ تھا جسے امریکہ نے اپنے حق میں استعمال کیا۔ جنگ کے دوران اسلامی تحریکوں کا عراق کے لیے جو موقف تھا، میں سمجھتا ہوں وہ عام طور پر غلط اور اسلامی نقطہ نظر سے بھی غیر معیاری تھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب: یہ اعتراض صرف ایک خاص زاویے کی حد تک محدود ہے، مسئلے کی پوری تصویر کے بارے میں نہیں۔ جبکہ معروضی حالات، زمینی حقائق اور تاریخی تناظر میں ان واقعات کے مختلف مضمرات ہو سکتے ہیں۔

سوال: میرے خیال میں اگر ہم اس کو خالص اسلامی تناظر میں رکھ کر دیکھیں تو؟

جواب: نہ صرف اسلامی تناظر میں، بلکہ اس کو واقعاتی تناظر میں بھی دیکھیے تو ایک سے زیادہ پہلو اور مضمرات سامنے آتے ہیں۔ بلاشبہ عرب وزراء تقسیم تھے اور یہ از خود اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ یہ صورت حال علاقائی سطح پر عربوں کے مفاد میں نہیں تھی۔ اگر اختلاف رائے چالیس پچاس چیزوں کے اندر ہو تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اب کوئی اور حل باقی نہیں ہے یا کوئی اور راستہ نہیں نکل سکتا۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ کیا فی الحقیقت صدام کویت پر حملے کے بعد سعودی عرب پر حملہ کر رہا تھا یا نہیں؟ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ ایک خیال یہ تھا کہ وہ حملہ نہیں کر رہا تھا۔ دوسرا موقف یہ تھا کہ وہ سعودی عرب پر حملہ کر رہا تھا اور سعودی عرب کو اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیئے تھا۔ گو یہ چیز ثابت نہیں ہوئی اور امریکی صدر جارج بش نے بھی اپنی فوجیں بھیج دینے کے بعد یہی بات تواتر کے ساتھ کہی کہ "ہم فوجیں اس لیے بھیج رہے ہیں کہ سعودی عرب کا دفاع کریں"۔ گویا کویت سے عراقی فوجوں کو نکالنا پہلا مقصد نہیں تھا۔ امریکہ نے یہ مقصد ظاہر کیا ہے نومبر کے مہینے میں۔ پورا اگست، ستمبر اور اکتوبر یہی موقف اختیار کیا گیا کہ "سعودی عرب سے ہمارا معاہدہ ہے۔" آن ریکارڈ ہے کہ بقول انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ شیفر، "کویت سے چونکہ ہمارا معاہدہ نہیں تھا، اس لیے ہم کویت کے لیے فوج نہیں بھیج سکے اور چونکہ سعودی عرب سے ہمارا معاہدہ ہے اس لیے ہم فوج بھیج رہے ہیں"۔

سعودی عرب کے لیے دوسرا راستہ یہ تھا کہ عرب لڑ رہے ہوں یا نہ لڑ رہے ہوں، وہ اپنے پانچ سات یا دس پندرہ دوست ممالک سے بات کرے اور ان سے مدد لے۔ میرا اپنا قیاس ہے کہ صدام کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ سعودی عرب پر حملہ کرتا، لیکن میں اس امکان کو بالکل مسترد بھی نہیں کرتا۔ اگرچہ غالب ترین بات یہ ہے کہ وہ حملہ نہیں کر رہا تھا۔ سعودی عرب کے شاہ فہد صاحب کو سب سے پہلے یہ قدم اٹھانا چاہیے تھا کہ وہ صدام سے ملتے اور کوئی راستہ نکالتے۔ شاہ فہد کے صدام سے گہرے ذاتی دوستانہ تعلقات تھے۔ ایران کے خلاف عراقی عرب قوم پرستانہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جنگ اور جنگی اتحاد کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سے یہ تعلقات تھے۔ شاہ فہد نے ہم سے خود یہ بات کہی کہ "پوری عرب لیڈر شپ میں میرا سب سے گہرا اور ذاتی دوست صدام تھا۔" لیکن یہ راستہ انہوں نے اختیار نہیں کیا یا نہیں کر سکے یا اختیار نہیں کرنے دیا گیا۔ یہ اقدام عراقی فوجوں کی مدینہ پیش قدمی کے امکان کو روک سکتا تھا۔

دوسری چیز یہ سامنے رہے کہ عرب لیگ کا سربراہی اجلاس ۹ اگست کو ہوا، جس میں پہلا خطاب مصر کے صدر حسنی مبارک کا تھا۔ صدر مبارک نے عرب علاقوں میں بیرونی فوجوں کے آنے کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ "عربوں کا علاقائی مسئلہ ہے، اس میں علاقائی قوتوں ہی کو آنا چاہیے، اس میں غیروں کی فوج کو نہیں بلانا چاہیے۔"

سوال: میرا خیال ہے معیاری صورت حال بھی یہی ہوتی؟

جواب: معیاری یا غیر معیاری کی بحث کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ دیکھیے کہ بحرانی صورت حال پیدا ہو چکی ہے اور ۹ اگست کو صدر حسنی مبارک جو اس میٹنگ کے چیئرمین اور میزبان ہیں، وہ یہ بیان دیتے ہیں۔ اس کے بعد ۱۰ اگست کو جو آخری اعلامیہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ "اتحادی فوجیں آئیں گی، مدد دیں گی اور اس میں ہم شریک ہوں گے"۔ یہ عرب لیگ کی تاریخ کی واحد قرارداد ہے جو انگریزی میں لکھ کر منظور کی گئی ہے اور بعد ازاں اس کا عربی ترجمہ جاری ہوا ہے، ورنہ آج تک عرب لیگ کی کوئی قرارداد ایسی نہیں ہے کہ جو پہلے عربی میں تیار نہ ہوئی ہو اور بعد میں انگریزی میں اس کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ بہرحال سوال یہ ہے کہ ان چوبیس گھنٹوں میں آخر کون سا انقلاب واقع ہو گیا تھا کہ جس کی بنا پر بالکل مختلف راستے کا انتخاب کر لیا گیا۔ بہتر ہوتا کہ اگر یہ چار پانچ عرب ملک ہی مل جاتے اور اپنے ساتھ پاکستان یا ترکی کو ملا لیتے تو کیا امریکہ کے بغیر ایک احتیاطی صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی تھی؟ کیا یہ ممالک اقوام متحدہ پر زور نہ دے سکتے تھے کہ وہ اپنی امن فورس لگا دیتی اور ایسی امن فورس اقوام متحدہ نے پہلے بھی مختلف مواقع پر مختلف جگہوں پر بھیجی ہے۔

سوال: تو آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ امن فورس کویت کو عراقی افواج سے خالی کرا لیتی؟

جواب: یہ اگست کی بات ہے، ابھی کویت کے بیرونی امداد کے ذریعے خالی کرنے کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ ان کے بقول مسئلہ سعودی عرب کے دفاع کا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوال: یہ سعودی عرب کے دفاع اور کویت سے عراق کے انخلاء کا بھی تو مسئلہ تھا؟

جواب: یہیں پر تو آپ معاملے کو Confuse (گڈمڈ) کر رہے ہیں۔ اگست میں اصل مسئلہ کویت کے خالی کرانے کا نہیں تھا، اصل مسئلہ یہ تھا کہ سعودی عرب صدام کی متوقع دست برد سے محفوظ ہو۔ عرب لیگ کی قرارداد، یو این او کے ریزولیوشن، صدر بش اور شاہ فہد صاحب کے بیانات پڑھ لیجیئے، ان کے مطابق کہیں بھی کویت کو خالی کرانے کے لیے امریکی افواج سعودی عرب میں نہیں آئی تھیں۔

سوال: عرب لیگ کی قرارداد تو آئی تھی کہ کویت کو عراق خالی کر دے؟

جواب: یہ مبنی برحق مطالبہ اپنی جگہ پر تھا۔ یہ مطالبہ ہم نے بھی کیا اور دوسرے لوگوں نے بھی، لیکن دیکھیں امریکی فوجیں کیوں بلائی گئیں؟ یہ فوجیں دراصل بلائی گئیں تھیں، صرف سعودی عرب کے دفاع کے لیے۔

سوال: چونکہ صدام حسین نے کویت کو عراق میں ضم کر لیا اس لیے سعودی حکومت یہی سمجھتی تھی کہ ہمیں اب کوئی عراق سے بچا نہیں سکتا اور نہ کویت کو آزاد کرا سکتا ہے، لہذا امریکہ کو دعوت دے دی گئی یا امریکہ نے زبردستی دعوت حاصل کر لی؟

جواب: اس میں تو کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ کویت پر عراقی قبضہ نہایت غلط اور غاصبانہ اقدام تھا اور اس پر ساری قراردادیں یہ تھیں کہ عراق کویت کو خالی کرے۔ لیکن نومبر میں مسئلے نے یہ رخ اختیار کیا کہ "کویت کو خالی کرانے کے لیے قوت کا استعمال کیا جائے گا"۔ جب کہ امریکی فوج تو سعودی عرب کے دفاع کے لیے بلائی گئی تھی۔ اس ضمن میں، میں امریکی صدر بش کے الفاظ آپ کو سناتا ہوں:

I have drawn a line on the sand and that is between the borders of Kuwait and Saudi Arabia.

تو بنیادی چیز یہ ہے کہ امریکی اتحادی فوج دفاع کے لیے تھی، انخلاء کے لیے نہیں تھی۔ یہ تبدیلی دو ماہ کے بعد نومبر میں آئی۔ پھر یہ کہا کہ "دیگر ذرائع استعمال کیے جائیں" آخر میں کہا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ "فورس استعمال کی جائے" جو کہ سلامتی کونسل میں دسمبر کی قرارداد ہے۔ یہاں پر سعودی عرب کے دفاع کا سوال نہیں اٹھایا گیا، حالانکہ فوجوں کی آمد وہاں پر کویت کو خالی کرانے کے لیے نہیں تھی، بلکہ سعودی عرب کے دفاع کے لیے تھی۔ سعودی عرب اپنے دفاع کے لیے امریکہ کی بجائے عرب اور دوسرے مسلم ممالک جو کہ تعاون کرنے کے لیے تیار تھے طلب کرتا تو مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں الجزائر بھی تعاون کر رہا ہوتا۔

سوال: الجزائر میں تو اگست کے دوران میں بن باللہ اپنی جلاوطنی کو چھوڑ کر وہاں گئے ہیں۔

جواب: الجزائر اور بن باللہ ایک چیز نہیں ہیں۔ اگر واقعات اور صورت حال کے موازنے میں احتیاط برتی جائے گی تو اور زیادہ حقیقت پسندانہ صورت سامنے آئے گی۔ شرعاً اور سیاسی اعتبار سے بھی امریکی فوجوں کے بلانے کو ہم عراق کے کویت پر قبضے ہی کی طرح امت مسلمہ پر ایک بڑا ظلم سمجھتے ہیں۔

سوال: کیا شرعی نقطۂ نظر سے کسی مسلم ملک کے لیے غیر مسلم ملک کی فوجیں بلانا منع ہے؟

جواب: جی ہاں بالکل! خاص طور پر جب حالات ایسے ہوں کہ آپ بالادست نہ ہوں، ایسی فوجی قوت کی کمان آپ کے ہاتھ میں نہ ہو، فیصلہ آپ نہ کر رہے ہوں۔ اور اگر وہ غیر مسلم افواج آپ کے تابع اور آپ کے زیر کمان نہ ہوں تو فقہا کے نزدیک ایسا امدادی فوجی پروگرام جائز نہیں۔ فقہا نے بڑی اچھی مثال دی ہے کہ جس طریقے سے شکار کے لیے آپ کتا استعمال کر سکتے ہیں، اسی طریقے سے آپ جنگ کے اندر غیر مسلم فوجی قوت کو بھی استعمال کر سکتے ہیں کہ جس میں وہ آپ کے تابع ہوں، لیکن اس شکل میں اجازت نہیں ہے کہ وہاں پر حکم اور کمان غیر مسلموں کی ہو، فیصلہ وہ کریں اور خود آپ ان کے تابع فرمان ہوں، اس امر کی اجازت اسلامی شریعت نہیں دیتی۔ اس پہلو سے اسلامی تحریکوں کے موقف کو مذکورہ اور حقیقی فریم ورک کے اندر دیکھا جائے تو بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ البتہ خلیجی جنگ کو اس تناظر میں نہ دیکھا جائے جو مغرب نے اپنے پروپیگنڈے کے زور پر ہمارے لیے تشکیل دیا ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی تحریکات کے لیے ضروری ہے کہ اس پورے واقعے اور اپنے موقف کا کھلے دل سے تجزیہ کریں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس معاملے میں ہمارے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے۔ جہاں اسلامی تحریکوں کو بیرونی سازشوں اور اسکیموں کا مقابلہ کرنا چاہیے وہیں، مسلم ممالک کی سیاسی اور مقتدر قیادت کی کمزوریوں کا بھی تنظیمی سطح پر بھرپور ادراک اور عوامی سطح پر ہمہ گیر ابلاغ کرنا چاہیے۔ عراق، کویت، سعودی عرب، ایران، مصر اور دوسرے مسلم ممالک سے اس معاملے میں جو عدم احتیاط ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ اس پورے تناظر میں وہ مغربی اقوام کے سامراجی عزائم اور مسئلے کے مضمرات کو قرار واقعی اہمیت نہیں دے سکے۔ میں نے سینیٹ کی تقریر میں بالکل کھلے انداز میں صدام حسین پر واشگاف تنقید کی۔ یہ میرے دل کی آواز تھی اور جنگ شروع ہونے کے ایک ہفتے کے دوران میں ہوئی تھی۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کے مستقبل کا معاملہ ایسے غبی، دون ہمت، اقتدار پرست اور بصیرت سے عاری لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، جو اس قسم کی حماقتیں، غلطیاں اور ظلم روا رکھنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

سوال: جیسی غلطیاں کہ صدر صدام اور شاہ فہد کرتے رہے؟

جواب: ایک دوپر کیا منحصر ہے یہ آج مسلمانوں کی ساری سیاسی لیڈرشپ کا مسئلہ ہے۔ مثلاً صدام اگر فی الحقیقت لڑ نہیں سکتا تھا تو پھر کیا چیز مانع تھی کہ اُس نے چودہ اور پندرہ جنوری ۱۹۹۱ء کو فرانسیسی صدر متراں اور سوویت یونین کے صدر گورباچوف کی بات قبول نہیں کی۔ محتسبوں کے نزدیک ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے امریکی مداخلت بلکہ امریکی ہمدردی کے پردے میں مغرب کے استعماری عزائم کو بے نقاب کیا اور درست کیا۔ لیکن افسوس کہ یہاں بھی وہی تاریخ دہرائی گئی کہ مسلمانانِ ہند نے تو خلافت عثمانیہ کے تحفظ کے لیے جان و مال کی بازی لگا دی اور دوسری طرف نوجوان ترک قیادت، خلافت عثمانیہ کی عبا چاک کر رہی تھی، کم و بیش یہی معاملہ عراق میں بھی ہوا۔

دوسری طرف اتحادیوں کے حلیف عرب ممالک میں بھی یہ ہوا، کہ وہ شخصی حکومتوں کی حفاظت کے بدلے میں بڑی حد تک اقتدارِ اعلیٰ سے تہی دامن ریاستوں کا استعارہ بن کر رہ گئے ہیں۔ گویا کہ دونوں جانب مسلم سیاسی قیادت کے ہاتھوں مسلم ممالک کی تصویر بڑی مایوس کن ہے۔ ان حکمرانوں نے ان ہندوستانی راجوں جیسا رول ادا کیا، جنھوں نے اپنے جھگڑے نمٹانے کے لیے پہلے خوشی خوشی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مدد کے لیے پکارا، اور پھر اپنا اقتدارِ اعلیٰ بھی گنوا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیا اور کچھ یہاں بھی کچھ ایسے ہی انداز سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ امریکہ آیا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلم ممالک کی سلامتی، اقتدارِ اعلیٰ اور مادی وسائل لھرانیوں کے ساتھ ساتھ پنجۂ یہود میں پھڑپھڑا رہے ہیں۔ پاکستان، ایران، سوڈان وغیرہ کو دہشت گرد ممالک قرار دینے کی دھمکیاں، ان کے دفاعی پروگراموں کو اڑا دینے کے عزائم، ان کے باعمل مسلمان شہریوں کے بنیادی حقوق پر قدغن، کشمیر میں قتل عام پر خاموشی، الجزائر میں مسلمانوں کے لہو کی ارزانی، فلسطین کے اصولی مسئلے کو بندر بانٹ کے ذریعے اڑانے کا اقدام، بوسنیا کے مسلمانوں کا حسرت ناک انجام، یہ سب کیا ہے؟ - اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جوہری تبدیلی مسلمانوں کے اس مرکزی علاقے میں امریکیوں کی بھرپور فوجی آمد کے ساتھ رونما ہوئی ہے۔

سود کا چیلنج اور اسلامی تحریک

سوال: بنیاد پرستی یا اسلامی راسخ العقیدگی کو مسلمانوں کے لیے آپ نے واحد متبادل کے طور پر پیش کیا ہے اور نوآبادیاتی دور کے بعد استعماری طاقتیں یہاں جو ریاستی ڈھانچہ دے کر گئیں اور کاروبار ریاست چلانے کے لیے جو لوگ انہوں نے پیدا کیے وہ بھی ناکام ہو چکے ہیں. اسی کے مد مقابل بنیاد پرست قوتیں ایک متبادل نظام کی نوید سنا رہی ہیں. جس کے لیے مسلمانوں میں کشش بھی پائی جا رہی ہے. یہی وجہ ہے مغرب کی طاقتیں اس سے خائف ہیں. مگر یہ ایک پختہ تاثر ہے کہ بنیاد پرست قوتوں کے پاس کوئی قابل اعتماد معاشی نظام نہیں ہے. اس ضمن میں بڑی رکاوٹ سود کا مسئلہ ہے. پاکستان میں ایک نیم دلانہ کوشش ہوئی. لیکن وہ آخر سودی نظام کی اتباع پر منتج ہوئی. پرائیویٹ سیکٹر میں انڈسٹریلائزیشن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کمرشل انٹرسٹ کے بغیر نہیں چل سکتیں اور کمرشل انٹرسٹ Usury نہیں. اس چیز نے مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کو بھی متاثر کیا ہے. آج صورت حال یہ کہ معیشت کی اسلامی تشکیل کے لیے اسلامی قوتوں کے پاس کوئی متبادل پروگرام نہیں ہے. میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بڑی ناکامی ہے؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب: آپ کے پیش کردہ ان مفروضوں سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ کمرشل انٹرسٹ اور Usury دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ Usury محض ایک اصطلاح ہے جو مغرب کے لوگ دھوکہ دینے اور کنفیوز کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ تاکہ سود اور Usury میں فرق کیا جا سکے، حالانکہ فنی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح میں اس بات سے بھی اتفاق نہیں کرتا کہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں کے پاس کوئی معاشی پروگرام نہیں ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم اپنا معاشی پروگرام ابھی تک اتنی تفصیل کے ساتھ اور اتنے دلائل سے عام لوگوں کے سامنے نہ رکھ سکے ہوں کہ ہر شخص اس سے مطمئن ہو جائے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے اپنی معاشی اپروچ بالکل پیشہ ورانہ انداز میں پیش کی ہے۔ ہم نے وضاحت کی ہے کہ ترقیاتی حکمت عملی (ڈیویلپمنٹ اسٹریٹیجی) کیا ہونی چاہیے؟ ہم نے بتایا ہے کہ فراہمی روزگار کا مسئلہ کس طرح حل ہو سکتا ہے؟ ہم نے رہنمائی کی ہے کہ ٹیکسوں کے نظام میں اصلاحات کیا ہوں گی؟ ہم نے بتایا ہے کہ ملکیت کے معاملات کیسے طے ہوں گے؟ ہم نے بتایا ہے کہ سود کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے؟ پھر پرائیویٹ قرضوں اور کمرشل قرضوں کے لیے ہم نے بارہ متبادل طریقے مرتب کر کے دیے ہیں اور پرائیویٹ سیکٹر میں ان میں سے کچھ پر عمل کر کے بھی دکھلایا ہے۔ یہ سارا کام احیائے اسلام کی تحریکوں نے کیا ہے۔ لیکن ہماری اصل مشکل یہ ہے جو افراد برسر اقتدار رہے ہیں، وہ اس پر یقین نہیں رکھتے کہ اس پالیسی کو رائج کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پالیسی پر نہ عمل ہوا ہے اور نہ اس پالیسی کی طرف بڑھنے کے لیے کوئی پیش قدمی یا کوئی موثر کوشش کی گئی ہے۔

اگر میں صورت حال کو تاریخ کی ایک مثال سے واضح کروں تو کہا جا سکتا ہے کہ عملاً ہم اس مرحلے پر ہیں کہ جس مرحلے میں ۱۹۱۷ء سے پہلے اشتراکی نظریہ تھا۔ اس کے پاس ایک پروگرام ضرور تھا، لیکن اس کے پاس وہ ریاستی طاقت نہیں تھی کہ جس کے بل پر وہ اس کو نافذ کر سکے۔ اس بنا پر کسی کا یہ کہہ دینا کہ اسلامی تحریکوں کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے، یہ قطعی طور پر حقائق کے منافی بات ہے۔ میں پورے یقین سے یہ بات کہتا ہوں کہ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ یہ موقع دے تو ہم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پہلے دن سے اپنے نصب العین کی طرف تدریج کے ساتھ پیش رفت کریں گے۔ اس نظام کو تبدیل کرنے میں کتنا وقت لگتا ہے، اس کے لیے ایک عبوری اور عارضی مدت ناگزیر ہے اور یہ عبوری دور خود شریعت نے قبول کیا ہے اور اگر نیت درست ہے تو یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ اور یہ اضطراری چھوٹ ہمارے پروگرام کے اندر موجود ہے۔ سود

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے معاملے میں تو آج اتنا کام ہو چکا ہے کہ بہت سے غیر مسلم ماہرین معاشیات بھی اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ غیر سودی نظام ایک قابلِ عمل چیز ہے۔ لیکن چونکہ وہ عملاً موجود نہیں ہے اس لیے آپ اگر اس پر عمل نہیں کریں گے تو دوسرے کس طرح اُسے تسلیم کریں گے؟ اسی طرح جو اسلامک بینک قائم ہوئے ہیں، وہ صرف ایک جزوی تجربہ ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ پرائیویٹ سیکٹر کے اندر ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ایک عام شہری کے لیے سود سے پاک کچھ سہولتیں فراہم کریں۔ جب تک اس کے پیچھے ریاستی قوت موجود نہ ہو اسے پوری طرح پیش نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان کے چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے موقعے پر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی طرف سے ہم نے ایک ماڈل دیا کہ اسلامی فریم ورک میں ترقیاتی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے[1] اور میرے خیال میں پاکستان میں منصوبہ سازی کی جتنی دستاویزات آج تک آئی ہیں، ان سب پر وہ حاوی ہے۔ بعد ازاں اسی طرح کی ایک اور دستاویز پیشہ وارانہ انداز میں تیار کر کے "خود انحصاری کمیٹی" کی رپورٹ میں نے اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف صاحب کو دی تھی، جس میں دو اور دو چار کر کے دکھایا ہے کہ سود کا خاتمہ کیوں کر ممکن ہے، اور یہ کس طریقہ سے کیا جا سکتا ہے لیکن میاں صاحب نے اس رپورٹ کو بھی پارلیمنٹ میں پیش نہیں کیا۔ بہرحال ایسا نہیں ہے کہ ہم خلاء میں بیٹھے بس بیانات دے رہے ہیں اور غور و فکر اور عملی پیش رفت کا کوئی کام نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن ناکامی کا اصل باعث یہ ہے کہ مسلم ممالک میں اقتدار ان لوگوں کے پاس ہے جو اسلامی نظریے سے وابستگی سے شرماتے ہیں۔ باقی کسی بھی چیز کے نفاذ میں مشکلات تو ہوتی ہیں، یہ مشکلات خود، سرمایہ دارانہ، اور فلاحی ریاستی نظریہ کے علم برداروں کو بھی درپیش ہیں، جبکہ ان کے پاس قوت، وسائل اور وقت بھی موجود ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ جن کا ہمیں پورا پورا ادراک ہے اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ اپنے فریم ورک میں ہم ان شاء اللہ ان مشکلات کا حل نکال لیں گے۔

پرائیوٹائزیشن، اسلامی ترقیاتی حکمت عملی کا ایک حصہ بھی ہو سکتا ہے اور خالص سرمایہ دارانہ ظالمانہ نظام کو لانے کا آلہ کار بھی بن سکتا ہے۔ ہم ان دونوں چیزوں میں فرق کرتے ہیں۔ اس کو خالص سرمایہ دارانہ ظالمانہ نظام دوبارہ مسلط کرنے کا ایک جواز نہیں بننا چاہیے۔ ہم چاہتے

1. [ed: Khurshid Ahmed and Others] "*Elimination of Riba from the Economy*" (1994), Khurshid Ahmad "*Development Strategy; Islamic Approach*" (1994) and "*Development Strategy for the Sixth Five Year Plan*" (1983), Institute of Policy Studies, Islamabad.

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں کہ پرائیوٹائزیشن درست اور شفاف طریقے سے ہو، جس کے ذریعے ہم اسلامی عدل قائم کر سکیں اور ایک عادلانہ نظام کی طرف قدم بڑھا سکیں۔ ہماری سوچ میں اور سرمایہ دارانہ سوچ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اس وقت ہم ایک نئی اسٹڈی لائے ہیں، جس میں پوری مسلم دنیا کو سامنے رکھ کر ہم نے بتایا ہے کہ غربت کے خاتمے کی اسلامی حکمتِ عملی کیا ہے۔

پرائیوٹائزیشن اور اسلامی معاشی حل

سوال: آپ نے کہا ہے کہ "پرائیوٹائزیشن" اسلامی معاشی پروگرام کو نافذ کرنے کے لیے ایک وسیلہ بھی ہو سکتی ہے اور ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام آلہ کار بھی بن سکتی ہے۔ گویا کہ اسلام پوری معیشت کو سرکاری یا پبلک سیکٹر میں نہیں رکھتا، بلکہ پرائیوٹائزیشن کا اس میں غالب حصہ ہوتا ہے۔ صدر محمد ضیاء الحق کے دور میں ایک رپورٹ آئی تھی کہ سود کو اس وقت تک ختم نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ ملکی معیشت مکمل طور پر سرکاری تحویل میں نہ لے لی جائے۔ اگر ہم نے نجی شعبے کا رول رکھنا ہے اور اس کو غالب کردار دینا ہے تو پھر سود سے کوئی مفر نہیں۔؟

جواب: نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اس وقت ایچ یو بیگ صاحب (وفاقی فنانس سیکرٹری) کی صدارت میں بننے والی کمیٹی میں ڈاکٹر نواب حیدر نقوی صاحب اس رپورٹ کے مرکزی صورت گر تھے۔ لیکن یہ رپورٹ کبھی گورنمنٹ نے قبول نہیں کی اس لیے ظاہر بات ہے کہ یہ پالیسی نہیں بنی۔ میں نے اس رپورٹ کا بھی محاکمہ کیا تھا۔ نیز اس رپورٹ کی جو تلخیص آپ نے اپنے سوال میں پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے وہ بھی منصفانہ نہیں ہے۔ پوری معیشت کو سرکاری تحویل میں دینے کی بات درست نہیں۔ بلاشبہ اس رپورٹ میں "مضاربہ" اور "مشارکہ" کی بنیاد پر تبدیلی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، مگر اس سے وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو آپ نکال رہے ہیں۔ پھر بعد کی متعدد تحریروں میں اس رپورٹ کے اصل مصنفین نے بھی نجی شعبے کے رول کے بارے میں اس موقف سے ہٹ کر بات کی ہے، جو اصل رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے اس رپورٹ کی حیثیت بس ایک رائے کی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوال: ایرانی حکومت کی راہ میں بھلا کیا رکاوٹ ہے؟

جواب: ایران کے بارے میں میری اپنی رائے یہ ہے کہ ایران بڑے غیر معمولی حالات سے گزر رہا ہے، جن میں آٹھ سال کی عراق ایران جنگ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہمہ گیر تباہی، افراط زر، اور ابھی تک ساری دنیا کا اس کے بارے میں مخالفانہ رویہ شامل ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے بینک کاری کی اصلاح کے لیے جو ماڈل بنایا ہے، وہ بحیثیت مجموعی درست ہے اور اس میں "مضاربت"، "مشارکت"، اور دوسرے Instruments کہ جنہیں اس دور کے اسلامی ماہرین معاشیات نے اختیار کیا ہے، انہوں نے قبول کیا ہے۔ پاکستان کے تجربے کے برعکس انہوں نے ایک سنجیدہ کوشش کی ہے، جس میں نفع و نقصان کی بنیاد پر معیشت میں لین دین کے رواج بڑھے ہیں۔ اور جو تازہ رپورٹس گزشتہ دو سال تک کی میں نے پڑھی ہیں، ان کے مطابق جو ٹوٹل لینڈنگ ہو رہی ہے اس کا اس وقت ۲۸ فیصد مشارکہ یا مضاربہ کی بنیاد پر ہے، جبکہ پاکستان میں یہ پانچ اور سات فیصد کے درمیان رہا ہے۔ یہ ایک نمایاں پیش رفت ہے، گو ابھی ایران میں بھی مکمل تبدیلی میں وقت لگے گا۔ اس میں ان کی خصوصی مشکلات رہی ہیں انھیں ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اور اسی بنا پر میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ جو مسلمان ملک بھی سنجیدگی کے ساتھ اس بارے میں کوشش کرے گا، وہ ان شاء اللہ راستہ نکال لے گا۔ اس میں بلاشبہ وقت لگے گا مشکلات بھی آئیں گی اور بین الاقوامی عدم تعاون بھی ہوگا۔ اس کی کلاسیکل مثال سوڈان ہے، جس نے کمزور معیشت، پستوں اور پرائیوں کی سازشوں، ایک علاقے میں بغاوت کی سی صورت حال اور امریکی اعلان شدہ دہشت گردی کے باوجود قابلِ قدر پیش رفت کی ہے۔

سوال: ایران میں عام رائے یہ ہے کہ وہاں بھی "مارک اپ" ہے جو اپنے اصل کے لحاظ سے سود ہے؟

جواب: سود تو نہیں البتہ ہاں سود کے قریب ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی شریعت نے اضطراری اور مجبوری حالات کے لیے کچھ ایسے راستے نکالے ہیں جو سود کے مزاج کے قریب ہیں اور انہیں صرف محدود حد تک اور کچھ خاص شرائط کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے، تاکہ وہ سود کی بنیاد نہ بنیں۔

معیشت کے وقتی معاملات کو حل کرنے کے لیے اس نوعیت کے معاہدات ہو سکتے ہیں اور اس کو شریعت کی اصطلاح میں "مرابحہ" اور "بیع موجل" کہتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک شے کی خرید اور فروخت کی دو قیمتیں ہو سکتی ہیں بشرطیکہ اس میں زمانی فرق ہو۔ مثلاً فرض کریں کہ کاغذ کی آج قیمت پانچ ہزار ڈالر فی ٹن ہے اور آپ کے پاس کاغذ ہے، آپ کہتے ہیں کہ اگر تم آج یہ کاغذ لیتے ہو تو پانچ ہزار ڈالر فی ٹن ہے، لیکن اگر تم یہ لے کر ایک سال کے بعد ادائیگی کرو گے تو پانچ ہزار کا نہیں بلکہ پانچ ہزار دو سو ڈالر کا فی ٹن ہوگا۔ آپ کو اس بات کا اختیار ہے کہ اس سے آپ اس قیمت پر خرید لیں جو آج سے ایک سال بعد کی ہوگی۔ اس کے لیے جو ادائیگی آپ نے کرنی ہے ایک سال بعد کریں گے، یعنی پیشگی سودا کیا جا سکتا ہے اور مستقبل کی قیمت میں فرق ہو سکتا ہے۔ یعنی "مرابحہ" شافعیہ کی اصطلاح ہے، فقہا حنفیہ نے "بیع مؤجل" کا راستہ کھلا رکھا ہے۔ اس میں بھی یہی شکل ہے کہ اس کی قیمت مختلف ہو سکتی ہے، لیکن جو صورت نہیں ہو سکتی وہ یہ ہے کہ آپ ایک چیز بیچ کر اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔ فروخت عملاً ہونی چاہیے یہ نہیں کہ وہ ایک نظری فروخت ہو۔ اسی طرح اگر بروقت قیمت آپ کو نہ مل سکے تو اس میں مزید اضافہ نہیں ہو سکتا خواہ ادائیگی میں کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو۔

اسی طرح فقہ نے چند دوسری شرائط بھی رکھی ہیں، جن سے معاملہ سود سے مختلف ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عملاً جیسا "مارک اپ" ہمارے بنکوں میں رائج ہے، اس میں ان شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا جا رہا۔ اس طرح یہ "مارک اپ" مرابحہ یا "بیع مؤجل" نہیں بلکہ عملاً سود ہی کی ایک شکل بن آ گیا ہے اور صرف نام اور عنوان کو تبدیل کیا گیا ہے۔ "مرابحہ" اور "بیع مؤجل" کے احکام پر عمل نہیں ہو رہا۔

سوال: آپ اس میں "خاص حالات" کی اصطلاح استعمال کریں گے یا اضطراری حالات کی؟

جواب: میرے علم کی حد تک فقہاء نے "اضطرار" کا لفظ استعمال نہیں کیا، وہ اسے "خاص حالات" کہتے ہیں، اسی لیے ہمارے کچھ فقہا یہ کہتے ہیں کہ "جس چیز کی اجازت ہے وہ عموم بھی ہو سکتا ہے"۔ لیکن یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ اجازت خاص صورتوں ہی میں پیش نظر ہے، اس کی عام اجازت نہیں ہوگی اور "اسلامی نظریاتی کونسل" نے بھی اپنی رپورٹ میں یہی بات کہی ہے۔ یعنی غیر معمولی حالات میں اس کی اجازت ہو سکتی ہے اور تجارت کی چند وقتی ضروریات کی بنیاد پر یہ راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا اس طرح سود کو تسلیم کرنے کا ایک طریقہ نہیں نکل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آئے گا؟

جواب: یہی تو ہو رہا ہے اور اسی بنا پر ہم نے اور خود اسلامی نظریاتی کونسل نے اس راستے کے اختیار کیے جانے سے واضح الفاظ میں اختلاف کیا ہے۔

سوال: میں نے پڑھا تھا کہ مولانا مودودی، نقد اور ادھار قیمتوں کے فرق کو تسلیم نہیں کرتے تھے؟

جواب: ایک تو وہ فقہا ہیں جو فقہ کی کتاب پر انحصار کرتے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ ہمارے فقہی مسلک کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ یہ کرنے کا راستہ ہے اس لیے یہ کر دو۔ لیکن جو افراد تفقہ والے ہیں ان سب نے یہ بات کہی ہے کہ قیمتوں کے اس فرق میں "شبیہ ربا" موجود ہے۔ (وہ اسے "ربا" نہیں بلکہ "شبیہ ربا" کہتے ہیں)، اس لیے اس میں احتیاط برتنی چاہیے۔

علامہ اقبال اور قائداعظم کا تصور پاکستان اور تحریک اسلامی

سوال: بانیانِ پاکستان یعنی علامہ اقبال اور قائداعظم نے ایک جدید اسلامی جمہوری ملک کا خواب دیکھا تھا. وہ ان معنوں میں "بنیاد پرست" نہ تھے جن میں آج کل یہ اصطلاح استعمال اور آپ حضرات پر منطبق کی جا رہی ہے. آپ جس طرح کا پاکستان تعمیر کرنا چاہتے ہیں، غالباً وہ بانیانِ پاکستان کے خواب کے مطابق نہیں؟

جواب: اس ضمن میں سب سے پہلے ایک اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق، رب اور روز جزا کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ جس نے انسانیت کے لیے آخری ہدایت کے طور پر قرآن پاک نازل فرمایا، اور اپنی ہدایت کی تکمیل کے لیے خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اس لیے ایک مسلمان کی پوری زندگی، چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں، کسی بھی حالت میں گزرے، ان کے لیے بنیادی سرچشمہ ہدایت اور آخری معیار حق قرآن و سنت رسول ہے۔ دیگر محترم سے محترم اور فاضل سے فاضل شخصیات کا مقام نہ صرف لازمی طور پر ان کے بعد میں آتا ہے، بلکہ ان کی آراء، افکار اور فیصلوں کو قرآن و سنت ہی کی کسوٹی پہ پرکھا جائے گا۔

اب میں آپ کے بنیادی سوال کی طرف آتا ہوں۔ یہ سوال بھی چند در چند مغالطوں میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مبنی ہے۔ سب سے پہلا مغالطہ یہ ہے کہ مفتیانِ مغرب نے بنیاد پرست کے معنی یہ وضع کئے ہیں کہ "وہ ترقی کا دشمن ہو، دورِ حاضر کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے والا ہو یا اسلام کی کسی ایسی تعبیر سے چپکا ہو، جس کی بنا پر اسلام وقت کے چیلنجوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔" امر واقعہ کے اعتبار سے یہ انتہائی غلط، یک رخا بد نیتی پر مبنی اور مبالغہ آمیز پروپیگنڈہ ہے۔ البتہ اس سے پہلے مغرب کے مستشرقین (Oreintalists) نے مسلمانوں کے ہاں بنیاد پرست کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال کی ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ اسلام جیسا کہ وہ ہے اور جیسا کہ مسلمان اس کو سمجھتے ہیں، اسے اس کی بنیادی روح کے مطابق نافذ کرنا چاہتے ہیں دراصل وہ بنیاد پرست ہیں۔

مغرب یہ چاہتا ہے کہ اسلام کا نام تو چاہے رہے، جس طرح کہ عیسائیت کا نام باقی ہے۔ لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار اللہ کی کتاب، الہامی ہدایت اور اسوہ رسول آخر الزماں ﷺ کو حاصل نہ ہو۔ بلکہ انسان اپنی ذاتی مرضی، بدلتے ہوئے اغراض اور مقاصد کی روشنی میں ان معاملات کو مغربی پیمانۂ فکر کے مطابق طے کرے۔ نیز یہ کہ جس چیز کو اہلِ مغرب پسند کرتے ہیں، بس آنکھیں بند کر کے وہ قبول کی جائے۔ اسی کے اندر مسلمان ڈھل جائے تو یہ "ترقی پسندی، تعمیری پسندی، عقل مندی، اور میانہ روی" ہے۔ اور اگر قرآن وسنت کی بنیاد پر مسلمان اپنے اصول، اپنے نظریے، اپنی روایات، اپنی تاریخ اور خود اپنی تہذیب پر عمل کرنا چاہے تو یہ "بنیاد پرستی" ہے۔ یہ بات مغربی دانشوروں کی ان تمام تحریروں میں نمایاں ہے، جو کہ آج مغرب سے آرہی ہیں۔ پروفیسر منٹگمری واٹ ایک مشہور مستشرق ہیں، انھوں نے حال ہی میں بہت کھل کے یہ بات کہی ہے: "دراصل اسلام کا جو روایتی تصور یعنی وہ تصور جو قرآن اور نبی پاک ﷺ نے پیش کیا ہے، اس کو پیش کرنے والے لوگ ہی بنیاد پرست ہیں۔ اور جو لوگ اسلام کو مغرب کے معیار پر بدلنے اور ڈھالنے کے لیے تیار ہیں، وہ لبرل ہیں اور وہی ہمارے اصل دوست ہیں"۔

اب یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کا موقف اس ذیل میں کیا تھا؟ علامہ اقبال کا آپ مطالعہ کر لیجیے۔ اقبال نے جدید اور قدیم دونوں علوم کے ماخذ سے استفادہ کیا اور پوری قوتِ ایمانی کے ساتھ یہ بات کہی کہ اسلام حق ہے اور مغرب جس بنیاد پر قائم ہے یعنی سیکولرازم، نیشنلزم، ریشنلزم، سائنس پرستی... یہ بنیاد، بنیاد خام ہے۔

علامہ محمد اقبال نے اسلام کو ایک انقلابی تصور کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں اگر آپ اقبال کے شعر کو جو ان کی فکر کے اظہار کا اصل میڈیم اور پیمانہ رہا ہے، نظر انداز بھی کر دیں تب بھی صرف "سالِ نو کا پیغام" دیکھ لیجیے جو انھوں نے اپنی وفات کے سال یکم جنوری

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۹۳۸ء میں دیا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ "اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے، جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی [وہ] مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا... وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو رنگ، نسل اور زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا" اور یہ تصور اسلام کا تصور ہے۔

علامہ محمد اقبال نے اپنی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے آخری خطبے میں جدید قانون سازی اور قانون ساز اسمبلیوں پر اپنی فکر پیش کی ہے۔ اس کے آخری حصے میں انہوں نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر برملا کہا ہے کہ "انسانیت کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مغرب ہے۔ اور یورپ کے دیے ہوئے تصورِ حیات سے جب تک انسان نجات نہیں پاتا، انسانی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور اسلام کے بتلائے ہوئے اصولوں کے مطابق کائنات کی نئی اخلاقی تعمیر، صاحب ایمان فرد کی دریافت اور معاشرے کی اجتماعی عدل پر تعمیر، یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر دنیا کو قائم کرنا چاہیے۔" یہی علامہ اقبال کا مشن تھا۔

اسی طرح بلاشبہ قائداعظم کا ایک دور وہ بھی تھا، جب وہ نہ صرف انڈین نیشنل کانگریس میں سرگرم عمل تھے، بلکہ اس کے مرکزی قائدین میں سے تھے۔ تب وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر تھے۔ گاندھی جی اور مدن موہن مالویہ کے رفیق خاص تھے۔ لیکن اس کے بعد جب قائداعظم نے برہمنی ذہنیت کا قریب سے مشاہدہ کر لینے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم نو کی اور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک مسلم انڈیا کے حالات کا بے لاگ تجزیہ کیا۔ تب وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان اپنے دین کی بنیاد پر، اپنے اخلاق، اپنے عقیدے، اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب و تمدن کی بنیاد پر ایک الگ قوم ہیں، محض ایک اقلیت نہیں ہیں۔ اور فکر اقبال کی روشنی میں ہندوستان میں مسلمانوں کے مسئلے کا حل اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے، وہاں ان کی آزاد اسلامی ریاست قائم ہو، جس ریاست کو وہ اسلام کی بنیادوں پر، اسلام

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے دیے ہوئے اصولوں کے مطابق قائم کریں۔ میں اس سلسلے میں قائداعظم کی آخری پانچ سال کی تقریروں کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں، جس سے معلوم ہوگا کہ قائداعظم کا اس معاملے میں کیا موقف تھا۔

جہاں تک جدید اسلامی جمہوری ملک کا تعلق ہے، اس ضمن میں علامہ اقبال اور قائداعظم جس بات کے حامی، اور علم بردار تھے اور جس بات کے لیے انھوں نے بھرپور جدوجہد کی وہ قرآن وسنت کی لاثانی اور ابدی ہدایات کی روشنی میں ایک مسلمان معاشرے اور ایک مسلمان ریاست کا قیام عمل میں لانا تھا۔ ایسا معاشرہ جو عمرانی عدل (Social Justice) کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور جس میں اسلام کا قانون جاری وساری ہو۔ جس میں مسلمان مغربی اقوام کی غلامی اور ان کی نقالی کی بجائے اسلام کو بطور دینِ ہدایت اور مستقل کلچر کی حیثیت سے پیش کریں، یہ تھا بانیانِ پاکستان کا تصور —— وہ لوگ کہ جو اس سے ہٹ کر چل رہے تھے ان کے اوپر علامہ اقبال اور قائداعظم نے گرفت کی اور خصوصیت سے ترکی پر، جو اپنے آپ کو یورپ کے سانچے میں ڈھالنے میں مصروف تھا۔

بالکل یہی وہ تصور ہے جس کو جماعت اسلامی نے پیش کیا ہے۔ جسے آج یہ لوگ "اسلامی بنیاد پرست" کہہ رہے ہیں۔ ہم دراصل قرآن وسنت رسول ﷺ سے ماخوذ اور اسلام کے تابع فکر اقبال اور قائداعظم کے تصور کو حقیقت کے روپ میں ڈھالنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ہمارے اور بانیانِ پاکستان کے تصور میں کوئی فرق نہیں۔ بانیانِ پاکستان کے تصور سے وہ لوگ ہٹے ہیں، جنھوں نے اس ملک میں بے دینی، مادیت، مغرب پرستی اور اباحیت کو رواج دیا، یا سوشلزم کی راہ ہموار کی یا اس کے حاشیہ بردار بنے۔ جنھوں نے سرمایہ داری کو یہاں پر فروغ دیا، اور جنھوں نے جاگیرداری کے ناسور کو بڑھنے اور پھلنے کے مواقع دیے۔ جو یہاں اسلامی قانون سے انحراف کے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ جنھوں نے یہاں علاقائی اور لسانی عصبیتیں پیدا کیں۔ ہم تو ان تمام کا مقابلہ اللہ تعالیٰ پر ایمان، دلیل اور یقین محکم سے کر رہے ہیں۔ ہم وہی لڑائی لڑ رہے ہیں جو علامہ اقبال اور قائداعظم نے لڑی تھی۔ یوں ہمارے اور بانیان پاکستان کے درمیان کوئی فکری یا عملی تصادم اور تضاد نہیں۔

سوال: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اقبال اور قائد اعظم تھیاکریسی کے مخالف تھے، مگر کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ تو کھینچ تان کر تھیاکریسی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب: یہ امر واقعہ بھی ہے، اور اسی حقیقت کا اظہار علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح دونوں نے کھل کر کیا ہے کہ اسلام تھیاکریسی نہیں ہے۔ کچھ لوگ ان بیانات کا سہارا لے کر یہ بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا کہ ہمارے اور ان کے موقف کے اندر فرق ہے۔ حالانکہ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اس موضوع پر جہاں بحث کی ہے، وہ "خطبات" کا چھٹا خطبہ ہے۔ اس خطبے میں انہوں نے یہ بات اس معنی میں فرمائی ہے کہ "گویا بہ حیثیت ایک اصول، عملِ توحید اساس ہے: حریت، مساوات اور حفظ نوع انسانی کی۔ اب اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ازروئے اسلام ریاست کا مطلب ہماری یہ کوشش ہوگا کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکان کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں۔ گویا ایک آرزو ہے ان اصولوں کو ایک مخصوص جمعیت بشری میں مشہود دیکھنے کی۔ لہذا اسلامی ریاست کو حکومت الٰہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو انہی معنوں میں، ان معنوں میں نہیں کہ ہم اس کی زمام اقتدار کسی ایسے سلطان ظل الٰہی کے ہاتھ میں دے دیں، جو اپنی مفروضہ معصومیت کے عذر میں اپنے جور و استبداد پر ہمیشہ ایک پردہ سا ڈال رکھے"[2] —— یعنی اسلام میں تھیاکریسی ان معنوں میں قطعی طور پر نہیں ہے کہ مذہب میں کوئی طبقہ اجارہ دار ہو اور بس وہی طبقہ اللہ کی مرضی کو جاننے کا واحد ذریعہ ہو۔ اسلامی تعلیمات اور اسلامی مزاج کی روشنی میں یہ فکر تھی علامہ اقبال کی۔

قائداعظم نے یہ بات کہی ہے کہ تھیاکریسی کا میں مخالف ہوں، اس لیے کہ اسلام میں کسی ایسے طبقے کا تصور نہیں ہے کہ جو دین کا اجارہ دار ہو۔ جیسا کہ بدھ مذہب، عیسائیت، ہندومت میں اور یہودیت میں پایا جاتا ہے۔ یہ بات اسی معنی میں سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی نے ہمیشہ اسی لہجے میں کہی ہے کہ "ہم تھیاکریسی کے مخالف ہیں۔ تھیاکریسی کا کوئی تعلق اسلامی نظام سے نہیں ہے"۔ اس ضمن میں مولانا مودودی کے موقف کو جاننے کے لیے ان کی کتب سے اس بات کی تائید ہوگی۔ اب اگر کوئی پڑھا لکھا آدمی پڑھے بغیر محض مغرب کے عطا کردہ الزام، اور اتہام کو عین علم قرار دینا چاہتا ہے تو یہ اس کی جہالت اور تنگ نظری کا

2. Dr. Mahammad Iqbal: The essence of Tauhid, as a working idea, is equality, solidarity and freedom. The state, from the Islamic standpoint, is an endeavour to transform the ideal principles into spacetime forces, an aspiration to realize them in a definite human organization. It is in this sense alone that the state in Islam is a theocracy, not in the sense that it is headed by a representative of God on earth, who can always screen his despotic will behind his supposed in fallibility. "*Reconstruction of Religious Thought in Islam*". [ed: Saeed Sheikh] 1986, pp.122-123

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ثبوت ہے۔

دراصل علامہ اقبال، قائد اعظم اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کا موقف ایک ہی ہے[۳]۔ جو افراد اس میں ٹکراؤ پیدا کرنے اور عملی سطح پر رخنہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ علمی دیانت نہیں برت رہے یا ان کی معلومات خام ہیں یا پھر وہ حقائق کا کھوج لگانے کے بجائے سیکولر تعصب میں مبتلا ہیں۔ ایسے عناصر نہ تھیاکریسی کے مفہوم سے آشنا ہیں اور نہ انھیں اسلام کے اجتماعی، سماجی، معاشی، بین الاقوامی اور سیاسی تصورات سے کوئی شناسائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پہلو سے انھیں قومی سطح پر بھی اپنے نقطہ نظر کی اصلاح کرنی چاہیے، تاکہ جو پیغام علامہ اقبال نے دیا تھا اور جس کے لیے قائد اعظم نے جدوجہد کی تھی، آج ہم اس کو عملی طور پر ملک میں قائم کر سکیں۔ مولانا مودودی تو فکری سطح پر اس کے موئد اور عملی طور پر اس کے نقیب تھے۔

اقبال کا تصور اجتہاد اور تحریک اسلامی

سوال: علامہ اقبال نے اپنے "خطبات" میں اجتہاد کا جو عملی تصور پیش کیا ہے، وہ اس انداز سے مختلف ہے، جو آپ لوگ قرآن و سنت سے منسوب کر کے پیش کرتے ہیں؟

جواب: نہیں، ایسی بات نہیں ہے، بلکہ یہاں بھی دراصل علامہ اقبال کو مغرب سے مرعوبیت کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ علامہ ان معنوں میں بڑے مظلوم ہیں کہ ان کی فکری وراثت کے اجارہ دار ہی ان کی معتبر فکر کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں۔ اس حوالے سے ہمیں مغرب زدہ عناصر اور الحاد و دہریت کے علم بردار حضرات کی اقبال دشمنی سے ہرگز کوئی گلہ نہیں، کہ انھیں تو اپنی فکری کج روی کے باعث ایسا کرنا ہی تھا، مگر افسوس ہے تو اقبال کے ان نادان دوستوں پر، جو اقبال کی مجموعی فکر کو مسخ کر کے پیش کرنے میں پیش پیش ہیں۔

اصولی طور پر اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر کسی دروازے کو قرآن و سنت نے کھلا رکھا ہے تو پھر اسے قرآن و سنت ہی اسے بند کر سکتے ہیں کوئی اور بند نہیں کر سکتا۔ اگر پہلی چار صدیوں میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا تھا تو پانچویں صدی میں کوئی نئی وحی تو نہیں آ گئی

۳۔ دیکھیے سید ابوالاعلیٰ مودودی "اسلامی ریاست" اسلامک پبلی کیشنز، لاہور-- پروفیسر عبدالحمید صدیقی "اسلام اور تھیاکریسی" ادارہ چراغ راہ، کراچی-- خورشید احمد "پاکستان میں قانون کی تدوین اور جمہوریت کا مسئلہ" کراچی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی کہ جس نے اسے بند کر دیا ہو۔ اس لیے نظری اعتبار سے اس معاملے میں سرے سے کوئی اختلاف نہیں۔ اجتہاد کا دروازہ کھلا تھا، کھلا ہے، اور کھلا رہے گا۔

علماء متقدمین نے اجتہاد کا لفظ تین معنی میں استعمال کیا ہے۔ ایک اجتہاد ہے، اجتہاد فی المسئلہ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس حکم کی تطبیق آپ کر رہے ہی اور اس تطبیق میں جو مسئلہ آپ کو معلوم ہے اس سے متعلق اور جو نامعلوم ہے اس کے بارے میں روشنی یا رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اس عمل کا دروازہ بھی کبھی بند نہیں ہوا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام شافعیؒ وغیرہ، انہوں نے اس ذیل میں جو رہنما اصول مرتب کر دیے ہیں، ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ معنی ہمیں روایتی فکر کے اندر ملتے ہیں، لیکن اصولاً ہماری نگاہ میں ہر قسم کے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے، بشرطیکہ اس کی اہلیت و صلاحیت موجود ہو اور اس معاملے میں اجتہاد کی ضرورت بھی ہو۔

یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ اجتہاد بلا ضرورت نہیں ہوا کرتا۔ اجتہاد کے معنی یہ نہیں کہ آپ کو ایک جنگل کاٹنا ہے۔ اجتہاد کے معنی صرف یہ ہیں کہ شریعت کی منشا کو جاننے کے لیے اگر احکام واضح اور نصوص متعین ہیں تو انھیں قبول کریں گے اور اگر کسی معاملے میں احکام واضح نہیں ہیں یا نصوص موجود نہیں ہیں تو پھر دانش کا استعمال کریں گے۔ لیکن دانش استعمال کرتے وقت لازماً کچھ ضابطے اور کچھ طریقے اختیار کیے جائیں گے۔ گویا ضرورت کے معاملے میں ہمارے اور اقبال کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم اس میں یقین رکھتے ہیں کہ جہاں ضرورت ہے، وہاں ضرور اجتہاد ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اجتہاد کے کچھ آداب ہیں اور اس کے لیے کچھ صلاحیت مطلوب ہے۔ اجتہاد کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ افراد جنھیں دین کی ابجد ہوز کا بھی علم نہیں یا اسی طرح ان کے برعکس جو دورِ حاضر کے معاملات کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں رکھتے، ان کو یہ حق دے دیں کہ وہ جس معاملے میں چاہیں رائے قائم کر لیں۔ اگر آپ ایک عدالت میں کیس پیش کرنے کے لیے شرط لگاتے ہیں کہ وہ شخص پیش ہو سکتا ہے جو وکیل ہو، جس نے قانون پڑھا اور قانون پڑھنے کے بعد جس نے اپنے آپ کو رجسٹرڈ کرایا ہو۔ اگر آپ ایک حکیم اور ایک ڈاکٹر کے لیے ایک علمی سطح متعین کرتے ہیں اور عطائیوں کو صحت و معاشرے کے لیے ناسور تصور کرتے ہیں، اسی طرح ایک انجینئر کے لیے ایک علمی و عملی مقام ضروری سمجھتے ہیں۔ تو کیا ان کے برعکس کیا دین ہی صرف ایک ایسی چیز رہ گئی ہے کہ اس میں جو چاہے علم و عمل کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بغیر اجتہاد کی طبع آزمائی کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں آ جائے۔ عہد حاضر میں بھی اجتہاد کے لیے: قرآن وسنت کا وسیع فہم، عربی زبان وادب کا ذوق، فقہی سرمائے سے گہری شناسائی، تقویٰ اور جدید معاشی وسیاسی فلسفے کے وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبال جیسے بلند پایہ قانون دان ایسے کسی غیر منصفانہ نقطۂ نظر کے قائل نہیں تھے، کہ جس میں ان بنیادی تقاضوں کو نظر انداز کیا جائے۔

علامہ اقبال نے خود اسی خطبے میں یہ بات کہی، کہ جہاں اجتہاد ضروری ہے وہاں اجتہاد کے لیے احتیاط، روایت کا احترام اور اجتہاد کرنے والوں میں علم، صلاحیت، خدا خوفی اور تقویٰ بھی ضروری ہے۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی اجتہادی رائے کے مطابق نئے دور میں بلاشبہ نیشنل اسمبلی کو اس بات کا حق دینے کی تائید کی ہے کہ دور حاضر میں وہ اجتہاد کی ذمہ داری ادا کر سکتی ہے۔ انھوں نے یہ بات خاص طور پر مصطفیٰ کمال پاشا کے ترکی میں تجربے کی روشنی میں کہی تھی۔ اس حوالے سے یہ بات بھی سامنے رہے کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک، کمال ازم نے اپنا لادینی چہرہ چھپایا ہوا تھا اور یہ اسی زمانے کی بات ہے۔ لیکن جب مصطفیٰ کمال پاشا کا اصل سیکولر چہرہ روز روشن میں سامنے آ گیا اور اس نے لادینیت اور خالص سیکولرازم کی بات کی تو علامہ اقبال تڑپ اٹھے۔ پھر انھوں نے واضح طور پر اس سے اپنی برأت کا اظہار کیا اور کہا:

نہ مصطفیٰ، نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

پھر علامہ اقبال نے مصطفیٰ کمال پاشا کو مخاطب کر کے ہی یہ فرمایا تھا:

لادینی و لاطینی، کس پیچ میں الجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کا، لاغالب الاھو

اور علامہ محمد اقبال نے ملت اسلامیہ کی قیادت کے ذہنی افلاس اور عملی انحراف کا نوحہ کچھ اس طرح کہا:

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی قیادت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

جس پس منظر میں علامہ اقبال نے یہ بات کہی ہے کہ اسمبلی کو اجتہاد کا یہ اختیار دیا جا سکتا ہے، اسی لیکچر میں علامہ اقبال جہاں قانون ساز اسمبلیوں کے کردار پر زور دیتے ہیں، وہاں پر وہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صاف صاف یہ بھی کہتے ہیں کہ "مجالس قانون ساز میں علماء کو بطور ایک مؤثر جزو شامل کر لیں، لیکن علماء بھی ہر امر قانونی میں آزادانہ بحث و تمحیص اور اظہار رائے کی اجازت دیتے ہوئے اس کی رہنمائی کریں۔ بایں ہمہ اسلامی شریعت کی غلط تعبیرات کا سد باب ہو سکتا ہے، تو صرف اس طرح کہ موجودہ حالت میں مسلم ممالک میں فقہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے، اس کی اصلاح کی جائے۔ فقہ کا نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے، لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ جدید فقہ کا مطالعہ بھی پوری احتیاط اور سوچ سمجھ کر کیا جائے"[۴]۔

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پھر علامہ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں فرمایا تھا "میری تجویز یہ ہے کہ علماء کی اسمبلی تشکیل دی جائے، جس میں وہ مسلمان قانون دان شامل کیے جائیں جنھوں نے جدید اصول قانون کی تعلیم حاصل کی ہے، تاکہ جدید حالات کی روشنی میں اسلامی قانون کا تحفظ کیا جائے اور اسے وسعت دی جائے۔ اس اسمبلی کو تسلیم کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے شخصی قانون کو تیار کرنے والا کوئی بل اس اسمبلی کی کٹھالی سے گزرنے سے پہلے قانون سازی کے لیے نہ رکھا جائے۔"

علامہ اقبال نے یہ نہیں کہا کہ منتخب اسمبلیوں کو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنانے کی کھلم کھلا آزادی دے دو۔ انھوں نے کہا ہے کہ بلاشبہ اسمبلی کو یہ اختیار دیا جا سکتا ہے لیکن اس اسمبلی میں اس صلاحیت کے لوگ ہونے چاہیں کہ وہ شریعت کو سمجھ سکیں اور ہم بھی یہی بات کہتے ہیں کہ آج کے دور میں اسمبلی، عدالت اور علماء ان سب کو اجتہاد کے عمل میں آنا چاہیے۔ لیکن یہ کام علم کے ساتھ ہی کرنے کی اجازت ہو گی، علم کے بغیر نہیں۔ اس پہلو سے ہمارا اور علامہ اقبال کا موقف ایک ہے۔

عالمان کم نظر کو اجتہاد کا حق دینے کے لیے اقبال تیار نہیں اور اگر عالمان کم نظر[۵]، اقبال کا سہارا لے کر اجتہاد کا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ حق نہ اسلام دیتا ہے اور نہ اسلام کا سپاہی اقبال ان کو یہ حق دیتا ہے اور نہ ہم ان کو یہ حق دیتے ہیں۔ اگر اسی منصفانہ سوچ کو یہ عناصر تھیاکریسی کا نام دیتے ہیں تو پھر ہمیں یہ الزام قبول ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ تھیاکریسی نہیں ہے کیونکہ یہاں ہر صاحب تقویٰ اور صاحب علم شخص کے لیے راستہ کھلا ہوا ہے۔ اس ذیل میں کسی کی اجارہ داری نہیں، وہ جدید تعلیمی اداروں سے آئیں، یا قدیم تعلیمی

۴۔ محمد اقبال "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" (خطبات) لاہور۔ ص ۲۷۱

۵۔ زاجتہاد عالمان کم نظر۔ اقتداء بر رفتگاں محفوظ تر (اقبال)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اداروں سے آئیں، وہ جبہ و دستار میں ملبوس ہوں یا کوٹ پتلون زیب تن کیے ہوئے ہوں، وہ مغرب کے ڈگری یافتہ ہوں یا مشرق کے تعلیم یافتہ، اگر ان کے پاس علم ہے، ان کے پاس تقویٰ ہے تو انھیں بجا طور پر یہ حق ہے کہ وہ اپنی رائے دیں۔ اس کے بعد دیکھیں کہ امت کا اجتماعی ضمیر ان اصحاب حل و عقد کی رائے کو کس انداز سے قبول کرتا ہے۔ گویا ہمارے اور علامہ اقبال کے تصور اجتہاد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم نے اس پر شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور اقبال کے تمام شعری اور نثری ماخذ و مصادر کو کھنگال کر دکھلایا ہے کہ اقبال کا تصور اجتہاد کس طرح تشکیل پاتا ہے[۶]۔

علامہ اقبال اس ضمن میں کھلی آزادی اور مغرب کی اندھی تقلید کو روا نہیں رکھتے، بلکہ وہ ان احتیاطوں کے ساتھ جو اسلام متعین کرتا ہے، بالکل انھی کے ساتھ ہی فکر نو کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں اور ہماری بھی یہی خواہش اور کوشش ہے۔ پروفیسر محمد منور مرزا صاحب نے اجتہاد سے متعلق اقبال کے اقوال کے بارے میں بجا طور پر کہا ہے کہ "حضرت علامہ کا تصور اجتہاد خود اجتہاد ہی کی طرح ارتقاء پسند اور ارتقاء پذیر رہا، لہذا ہمیں "تشکیل جدید" (یعنی "خطبات") کی روشنی میں اور مابعد کے مکتوبات، بیانات، خطبات اور تصریحات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ علامہ اقبال کی سوچ ۱۹۲۹ء تک پہنچ کر رک نہ گئی تھی"۔ یہ بات اقبال اور فکر اقبال کی منصفانہ توضیح ہے۔

کیا قائداعظم سیکولر پاکستان کے داعی تھے؟

سوال: کیا قائداعظم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنی مشہور تقریر میں آپ لوگوں کے تصور اسلامی ریاست کی مخالفت نہیں کر دی تھی؟

جواب: سب سے پہلے تو اپنے سوال کی اس مغالطہ انگیزی کو درست کر لیجیے کہ اسلامی ریاست کا تصور کوئی ہمارا وضع کردہ نہیں، بلکہ ہم نے ریاست، حکومت اور سیاست کے جن اصولوں کی طرف امت مسلمہ اور پھر دنیا بھر کو دعوت دی ہے، وہ قرآن و سنت رسول ﷺ، خلافت راشدہؓ اور مجموعی اسلامی فکر سے ماخوذ ہے۔ ہمیں بس یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ اس فکر

۶۔ ملاحظہ ہو ہمارے مضمون "اقبال اور اسلامی قانون کی تشکیل جدید" مطبوعہ "چراغ راہ" اسلامی قانون نمبر اور انگریزی مضمون Iqbal and Reconstruction of Islamic Law مطبوعہ مجلہ "اقبال ریویو"۔ اپریل ۱۹۶۰ء۔ اور "خطبات اقبال پر ایک نظر" از محمد سعید اکبر آبادی، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۷ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر حکمرانوں کی ملوکیت اور آمریت نے جو آہنی پردہ ڈال رکھا تھا، ہم نے اسے ہٹایا ہے۔ اس سوچ کو علماء و فضلاء کی جس اکثریت نے بے عملی اور فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھا دیا تھا، اسے بچانے کے لیے ہم کمر بستہ ہوئے۔ اس تہذیب کو مغربی سامراج اور اس کے دیسی حواریوں نے جس فدویانہ اور محکومانہ درس کا خوگر بنا رکھا تھا، ہم نے اس سے بغاوت کی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قائداعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تقریر قائداعظم نے بہت ہی مخصوص حالات میں کی تھی۔ پوزیشن یہ تھی کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس تھا، جس میں قائداعظم کو صدر منتخب کیا گیا اور اس انتخاب پر اظہارِ تشکر کرتے ہوئے قائداعظم نے یہ تقریر کی تھی۔

انہوں نے اپنے دل کے پھپھولے کھول کر قوم کے سامنے رکھے کہ آج برعظیم میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے، انسان، انسان کو قتل کر رہا ہے، خون بہایا جا رہا ہے، حقوق پامال ہو رہے ہیں اور یہ وہ پس منظر ہے جس میں انہوں نے یہ بات کہی کہ ہم جو ریاست حاصل کر رہے ہیں، اس میں کسی کا کوئی بھی مذہب ہو، خواہ وہ اسلام ہو، خواہ وہ ہندو مذہب ہو؛ ان سب کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔ اس تقریر میں مسئلہ ریاست کی نوعیت کا نہیں، بلکہ مسئلہ شہریوں کے حقوق اور جان اور مال کے تحفظ کا ہے۔ شہریت اور جان و مال کے تحفظ کے باب میں اسلام مسلمانوں اور غیر مسلموں کو برابر کا تحفظ اور برابر کے حقوق دیتا ہے۔ یہ روایت سیکولرازم کی نہیں، بلکہ اسلام کی ہے۔ اسی طرح قائداعظم کے الفاظ Business of the State کو بہت ایکسپلائٹ کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی علمی خیانت کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بزنس آف دی اسٹیٹ کا مقصود مطلوب Nature of the State نہیں ہوتا۔ بزنس آف دی سٹیٹ کے معنی صرف انتظام و انصرام سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی اور تعبیر نہیں کی جا سکتی۔

کچھ لوگ اس تقریر کو سیکولرازم کے جواز کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قائداعظم نے اس تقریر سے پہلے اور اس تقریر کے بعد بھی پاکستان کے اسلامی تشخص اپنانے، اسلامی قانون کو بنیاد بنانے، قرآن و سنت کی روشنی میں یہاں کے نظام کو ترتیب دینے اور اسلامی عدل اجتماعی کی بنیاد پر معاشرے کو استوار کرنے کی ضرورت و اہمیت کو تسلسل کے ساتھ بلا انقطاع بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے جو تقریر سٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر جولائی ۱۹۴۸ء میں فرمائی ہے، اس میں بھی اور اس سال عید کے پیغام میں بھی انہوں نے کہا ہے کہ "ہم ملک میں اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں" —— سوال یہ ہے کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قائد اعظم کی محض ۱۱ اگست والی تقریر ان کے باقی تمام اقوال سے ہٹ کر رہ گئی ہے اور وہ ان کی پہلے اور بعد والی تمام تقاریر و بیانات کو منسوخ کر دینے والی تقریر ہے؟ محض یہی ایک الہامی تقریر ہے اور ان کی باقی تمام بے وقعت تقاریر ہیں۔ کسی شخص کے فکر اور تصور کو سمجھنے کے لیے کیا کسی ایک چیز کو اس کے سیاق و سباق سے نکال کر کے دیکھا جاتا ہے یا فیصلہ کرنے کے لیے اس کی ساری چیزوں کو سامنے رکھا جاتا ہے؟ اور اگر ساری چیزوں کو سامنے رکھا جاتا ہے تو قائد اعظم کا تصور اسلامی ریاست بھی بالکل واضح ہے۔

پھر کیا ان لوگوں کی نگاہ میں قائد اعظم اتنے بے اصول انسان تھے کہ قوم سے وعدہ تو انہوں نے اس بات کا کیا، کہ میں تمہیں پاکستان کی جدوجہد میں شرکت کی اس لیے دعوت دے رہا ہوں تاکہ تم ایک نظریاتی قوم کی حیثیت سے، اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کی علم بردار قوم کی حیثیت سے جدوجہد کرو اور ابھی آزادی ملنے میں تین دن باقی ہیں، لیکن وہ اپنے سارے کیے دھرے کے اوپر پانی پھیر دیں، اس سے یک دم پیچھے ہٹنے کا اعلان کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ میں تو ایک لادینی اور سیکولر اسٹیٹ کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔ پھر اس کے بعد دوبارہ ایسی تضاد بیانی کا شکار ہوں کہ ستمبر ۱۹۴۷ء سے لے کر جولائی ۱۹۴۸ء تک جتنی تقاریر کریں، ان میں پھر وہ اسلام کی باتیں تکرار سے کرنے لگ جائیں۔

لیکن معاف کیجیے قائد اعظم نہ تضاد بیانی کے قائل تھے۔ اسی طرح نہ بے اصول تھے، نہ قائد اعظم پر کسی قسم کی ژولیدہ فکری کا الزام لگایا جا سکتا ہے اور نہ ان پر نفاق کی تہمت لگائی جا سکتی ہے۔ وہ ہمیشہ جرأت کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہے، جس بات کو درست سمجھا ہے اس کو برملا کہا ہے انہوں نے متضاد باتیں نہیں کی ہیں۔ قائد اعظم کی اس تقریر کو ان کی باقی تقاریر کے پس منظر میں دیکھنا ہوگا اور اسی کے مطابق تطبیق اور اس کی تعبیر کرنا ہوگی۔ ان کی یہ بات بالکل درست ہے کہ اسلام میں تھیاکریسی نہیں ہے اور اسلام میں شہریت کے حقوق برابر ہیں۔ یہ بات اسلام کے مطابق ہے، جس میں مسلمان، غیر مسلم سب شہری یکساں حقوق کے مالک ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنی شہریت کے تقاضے پورے کریں۔ اس کے ساتھ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ پاکستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہوگا یا پاکستان ایک ایسی اسٹیٹ ہوگا جس کا مذہب اور دین سے کوئی تعلق نہ ہو یا اسلامی قوانین جاری نہ ہوں، —— ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس تقریر کی غلط تعبیر ہوگی۔

قائد اعظم پر میری نگاہ میں یہ ایک الزام اور بہتان ہے۔ ان تمام الزاموں سے بڑا الزام اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بہتان ہے، جو قائداعظم کے بڑے سے بڑے ناقد اور مخالف بھی ان پر لگانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن وہ لوگ جو قائداعظم کی فکر کے علم بردار بنتے ہیں، وہی دراصل قائداعظم کے کردار کو گھنانے کے لیے یہ کام کر رہے ہیں اور ہم اس کے مقابلے میں قائداعظم کے خیالات کی جو تعبیر کر رہے ہیں، وہی ہے جو ان کے پورے کریکٹر سے، ان کے تمام ارشادات سے ہم آہنگ ہے اور جس میں بجا طور پر قائداعظم کی ایک دیانت دارانہ، منصفانہ اور خود ان کی امنگوں کی ترجمان تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

عورت کی سربراہی اور اسلامی تحریکیں

سوال: یہ احساس بڑی شدت سے پایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی اور اسی نوعیت کے دوسرے "بنیاد پرست" حضرات کا رویہ جدید صنعتی دور میں عورت کی فطری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ بنیاد پرستی سے منسوب آپ رہنماؤں کا مجموعی رویہ عورت کا دل جیتنے کے بجائے ایک جدید تعلیم یافتہ عورت کے دل و دماغ میں اسلام کے بارے میں وسوسے پیدا کرتا ہے۔ جب اسلام دین فطرت ہے تو پھر کیا یہ خواتین کو مناسب اور برابری کے حقوق عطا نہیں کرتا؟

جواب: بلاشبہ اسلام دین فطرت ہے اور اسلام عورت کو نہ صرف مناسب حقوق دیتا ہے، بلکہ صحیح معنوں میں برابری کے حقوق بھی دیتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کے قائدین ہی کا نہیں، بلکہ اس معاملے میں بھی علامہ اقبال ہی کا مطالعہ کر لیا جائے اور خصوصیت سے "رموز بے خودی" کو کھلی آنکھوں سے پڑھا جائے، جس میں انہوں نے مغرب کے عورت سے متعلق رویوں کا جو تجزیہ کیا ہے، اسے ذہن میں رکھا جائے، تو "عورت اور اسلام" کے بارے میں مغرب کی تشکیل شدہ ابلاغی جارحیت کا جواب مل جاتا ہے۔

اسلام اور ایک مسلم معاشرے میں عورت کا یہ مقام ہے، کہ وہ ایک ماں، ایک بہن، ایک بیوی، ایک بیٹی کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ مسلم معاشرے میں عورت کو عورت سمجھ کر اور عورت رکھ کر ہی ترقی کا راستہ دکھایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب نے جو ترقی کا راستہ نکالا ہے اس میں عورت، عورت نہیں رہتی۔ ہمارے نزدیک عورت کے ساتھ تاریخ میں ظلم تو ہمیشہ ہوا ہے، ماضی میں عورت کو عورت رکھتے ہوئے اس پر ظلم کیا گیا، اسے پست کیا گیا، اسے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پابند بنایا گیا، اسے غلام رکھا گیا اور اسے ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن آج کے مغرب نے "ترقی اور برابری" کے خوش نما نعروں کے فریب میں عورت پر جو ظلم کیا ہے، اس نے عورت کو اس کی نسائیت سے محروم کر دیا ہے، اسے He - Woman بنانے کی کوشش کی ہے اور یہ سب سے بڑا المیہ عورت کے "حقوق" کے نام پر ہوا ہے۔

یہ در حقیقت "انقلاب" کے نام پر سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کی ایک سازش تھی، جنہوں نے سستی مزدوری کی خاطر عورت کو گھر سے نکالا اور اس کے نتیجے کے طور پر صرف عورت ہی کے لیے نہیں، بلکہ پورے صنعتی حلقے کے لیے غیر متناسب معاوضے رکھے۔ آج بھی ڈیڑھ دو سو سال کی نام نہاد ترقی، اور نسوانی حقوق اور مساوات کے اعلانات کے باوجود مردوں اور عورتوں کے معاوضوں میں امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے۔ دراصل یہ عورت کی ترقی نہیں، بلکہ یہ عورت کا استحصال ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عورت کو عورت رکھتے ہوئے، عورت کو ترقی کے تمام مواقع دیتے ہیں اور یہی اسلام کی بنیادی شان اور امتیازی آن ہے۔

قرآن نے جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے، وہ یہ ہے کہ بحیثیت انسان، عورت اور مرد بالکل برابر ہیں۔ ان کے لیے ایمان لانے کا معیار ایک ہے، آخرت میں جواب دہی کا پیمانہ ایک ہے اور آخرت میں کامیابی اور ناکامی کی میزان بھی ایک ہے۔ آپ قرآن کا حسن بیان دیکھیں کہ اس نے مومنین، مومنات، صادقین، صادقات، محسنین، محسنات، یعنی ہر جگہ دونوں کو برابر رکھ کر کلام کیا ہے۔ اس کے بعد اسلام نے ہر ایک سے اس کی ضرورت، اس کی فطرت، اس کے سماجی کردار کے مطابق کام لیا ہے اور ترقی کے مواقع دیے ہیں۔ یہی ہمارا تصور ہے اور یہ تصور نہ تو ترقی کی راہ میں حائل ہے اور نہ کسی دوسرے پہلو سے عورت کے لیے ضرر اور استحصال کا سبب بنتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ صرف دو تہذیبوں کا فرق دیکھیے۔ ایک مغربی کلچر ہے، جس نے صنعتی انقلاب میں عورت کو بطور مزدور استعمال کیا اور گھر کو تباہ کر کے یہ ہدف حاصل کیا۔ اس کے برعکس جاپان نے ہر چند کہ وہ کوئی اسلامی ملک نہیں تھا، اس نے بھی صنعتی ترقی کی، عورت کی لیبر کو استعمال کیا، لیکن گھر کے ادارے کو تباہ کیے بغیر۔ معلوم ہوا کہ صنعتی ترقی کے تقاضے پورے کرنے کے بہت سے راستے ہیں، کوئی ایک راستہ ہی نہیں۔ ہم وہ راستہ اختیار کریں گے، جو ہمارے کلچر، ہماری اقدار اور ہماری قومی منزل سے مناسبت رکھتا ہے۔

آپ کے سوال میں ایک لفظ "برابری" (Equality) بھی قابلِ غور ہے۔ اس لفظ کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی بڑا کنفیوز کیا گیا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ "مغرب کا تصور مساوات مرد و زن برابری کو معیاری اور مطلوب سطح پر لاتا ہے، اور اسلام جس میں حقیقت اور ضرورت کی مناسبت سے مختلف جگہ پر مختلف فرق کیے گیے ہیں، وہ برابری کے معنی میں نہیں ہیں"— میرے نزدیک یہ "مغرب کے ملاؤں" یا ان کی چال چلنے والے مشرق کے "مغرب زدہ ملاؤں" کا بے معنی الزام ہے۔ تنوع اور فطرت حقیقت ہے۔ اس تنوع اور اس فطرت کو ختم کرنا ہی دراصل جبر و استبداد ہے۔ یہ جبر برابری کے نام پر کیا جائے یا کسی اور نام پر کیا جائے۔ اسلام اس میں جہاں جہاں فرق رکھتا ہے، ہم اس فرق کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن اسلام کا پیش کردہ تصور عدل و انصاف اور معروضی حقائق پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ سے عورت اور مرد کی حیثیت میں فرق نہیں پڑتا۔ اس کے بنیادی مقام و مرتبے اور ذمہ داری یا جواب دہی میں فرق نہیں آتا۔ مثال کے طور پر اگر شہادت کے قانون میں ایک جگہ اسلام نے یہ ضابطہ بنایا ہے کہ یہاں صرف عورت کی شہادت قبول ہو گی، مثلاً زچگی، رضاعت وغیرہ تو اس میں مرد کی شہادت قبول نہیں ہو گی۔ اور دوسری جگہ بتایا کہ یہاں مرد کی شہادت قبول ہو گی تو یہ عدم مساوات نہیں، یہ وہ انصاف پسندی ہے جو فطرت اور ضرورت نے متعین کی ہے اور اس کا تعلق حقوق سے نہیں ہے۔ اور جہاں حقوق کا معاملہ ہے وہاں اسلام نے حقیقی معنوں میں عدل قائم کیا ہے، جبکہ "مساوات" کا لفظ مغرب کا محض وہ کھوکھلا نعرہ ہے جو نہ تو آہنگی اشتراکیت دے سکی، اور نہ تہذیبی بیماری کا شکار امریکہ و یورپ آج تک قائم کر سکا ہے۔

سوال: اگرچہ آپ خواتین کو ووٹ کے حق سے محروم نہیں کرتے، لیکن ریاست کے اہم مناصب یعنی صدارت، وزارت عظمیٰ وغیرہ انہیں دینے سے انکار کرتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں مولانا مودودی نے محترمہ فاطمہ جناح کی امیدواری صدارت میں ان کی حمایت کر کے گویا باقاعدہ اجتہاد سے کام لیا تھا، اور وہ بلاشبہ دور حاضر میں سب سے زیادہ روشن خیال بنیاد پرست تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہاں پر محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی مخالفت کی گئی اور بنگلہ دیش جماعت اسلامی نے ۱۹۹۱ء میں وہاں پر پارلیمنٹ میں وزارت عظمیٰ کے لیے بیگم خالدہ ضیاء کی حمایت کی۔ میں یہ بات کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آج کے احوال وظروف کو مد نظر رکھتے ہوئے، مولانا مودودیؒ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ۱۹۶۴ء کے اجتہاد کو کیوں نہ برقرار رکھا جائے؟

جواب: شکریہ، سب سے پہلے تو مجھے یہ خوشی ہوئی کہ کم از کم بنیاد پرستوں میں آج ایک اور قسم کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے "روشن خیال بنیاد پرست"۔ اس عنایت سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ مولانا مودودی کے جو مختلف اجتہاد ہیں، ان میں کچھ روشن خیال ہیں اور کچھ اتنے زیادہ روشن خیال نہیں ہیں۔ لیکن بہرحال یہ حق میں آپ ہی کو دیتا ہوں کہ آپ یہ طے کریں کہ کیا چیز روشن خیالی ہے اور کیا چیز تاریک خیالی ہے۔ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں نے تو مولانا مودودی کو بحیثیت مجموعی بہت زیادہ روشن خیال اور متوازن ہی پایا ہے اور مجھے ان میں معروف معنوں میں اس نام نہاد بنیاد پرستی کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی، جو آج مغرب کے سیاست دان اور ذرائع ابلاغ ان کے اور اسلامی تحریکوں کے سر پر تھوپ رہے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ بلاشبہ اسلام عورت کو ووٹ کا حق دیتا ہے اور اسلام نے عورت کو ووٹ کا حق اس وقت دیا، جب ابھی یورپ نے ووٹ کے معنی بھی نہیں سمجھے تھے۔ آج بھی سوئٹزرلینڈ کی دو ایک ایسی ریاستیں ہیں، جہاں عورت کو ووٹ کا حق ہے اور نہ منتخب ہونے کا حق۔ انگلستان اور امریکہ کی جمہوریت میں عورت کو ووٹ کا حق پہلی جنگ عظیم کے بعد بیسویں صدی کے تیسرے دہے (Decade) میں ملا تھا۔ بہرحال ہماری لیے وہ کوئی قابل تقلید مثال نہیں ہیں۔

اسلام نے اپنا نظام بنایا ہے اور اس نظام میں کچھ ذمہ داریاں بھی تقسیم کیں اور انھی ذمہ داریوں کی تقسیم کی مناسبت سے سوسائٹی کے مختلف طبقوں اور افراد کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس معاملے میں اسلام نے گھر اور خاندان کو تہذیب کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ عورت اور مرد کے اختلاط اور مخلوط مجلسی زندگی کی اسلام نے حوصلہ شکنی کی ہے۔ اسلام نے گھر کے نظام میں عورت کو ملکیت کا حق دیا، تجارت کا حق دیا، نفع کمانے کا حق دیا ہے اور یہ حق دیا کہ اپنا نفع وہ اپنے پاس رکھے۔ لیکن خاندان اور گھر کی مالی ضروریات کو پورا کرنا شوہر کا ذمہ قرار پایا اور عورت کے اوپر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی۔ اگر شوہر غریب بھی ہو تب بھی وہ عورت کی ذاتی دولت سے گھر کی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے اس پر قبضہ جمانے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ اسلام کا مزاج ہے، جس کو اس نے ہر جگہ قائم کیا۔ اسی تناظر میں معاشرے کے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اسلام نے عورت کو رائے کا حق بھی دیا ہے۔

اسلام نے عورت کو یہ حق بھی دیا ہے کہ اجتماعی امور میں وہ اپنی رائے دے، اس سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشورہ لیا جائے، وہ معاملات جن کا عورت سے براہ راست تعلق ہو اس میں ان کو فیصلے کا اختیار بھی دیا جائے اور وہ معاملات جو براہ راست ان سے متعلق نہیں ہیں، ان میں انھیں مشورے کے لیے شریک کیا جائے۔ لیکن ان کے نفاذ کا جو نظام اسلام نے بنایا ہے، اس میں ایک فوج کے سربراہ، ایک ریاست کے سربراہ وغیرہ کی ذمہ داری بہر طور پر مرد پر ہے، عورتوں پر نہیں ڈالی گئی ہے۔ یہ اسلام کی اصولی پوزیشن ہے۔ لیکن اگر کبھی غیر معمولی حالات ہوں تو اس قطعی طور پر محدود اور غیر معمولی حالت کی حد تک اس میں رعایت اور اختلاف کی گنجائش بھی موجود ہے۔

اس کی مثال بالکل اس طرح سے ہے جیسے اگر ضرورت پڑ جائے تو جان بچانے کے لیے وہ چیزیں جو عام حالات میں اسلام میں قطعی طور پر حرام ہیں، ان چیزوں کو محض اور محض ضرورت کی حد تک استعمال کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ یہی وہ فریم ورک ہے، جس میں مولانا مودودی نے ۱۹۶۴ء میں اور صرف مولانا مودودی ہی نے نہیں بلکہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور اس ملک کے دوسرے علماء کرام نے یہ رائے دی کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کی آمریت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایسی خاتون کو جو پورے ملک و قوم کی نگاہ میں محترم و معزز ہیں، ان کے ذریعے اس آمریت کو سرنگوں کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے، کہ ایوب خان نے مارشل لاء کے تحت اسلام کے عائلی قوانین میں زبردستی تبدیلی کی، آمریت کے ذریعے مشرقی پاکستان میں بددلی پیدا کی، پارلیمانی جمہوریت کے بجائے بالواسطہ انتخابات اور صدارتی نظام کو نافذ کیا گیا تھا۔ جس نے پورے ملک کا سماجی ڈھانچہ اور سیاسی وجود ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان غیر معمولی حالات میں مولانا مودودی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس بات کو مناسب سمجھا کہ محترمہ فاطمہ جناح کی صدارت کی امیدواری کی تائید کریں اور میں خود بھی اس فیصلے کی تائید میں لکھنے والوں میں شریک تھا[۷]۔ غیر معمولی حالات میں شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اجتماعی ضروریات اور اجتماعی مصالح کے تحت اس نوعیت کے فیصلے کیے جا سکتے ہیں۔ مخصوص حالات کی چیز کو عمومی درجہ دینا چیزے دگر ہے۔

اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ محترمہ فاطمہ جناح نے بڑی عالی ظرفی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے قوم سے اس بات کا وعدہ کیا کہ "میں یہ الیکشن جیتنے کے بعد پارلیمنٹری سسٹم کو بحال کروں گی" اور اس طرح گویا کہ انہوں نے ایک طرف ان مخصوص حالات میں صدارت کی ذمہ داری قبول

۷۔ ملاحظہ ہو میرا مضمون جو ماہ نامہ "فاران" ۱۹۶۴ء میں بطور اداریہ شائع ہوا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی تھی اور دوسری طرف اسے ایک عارضی انتظام تصور کیا اور یہ وعدہ کیا صدارتی نظام سے ہٹ کر ہم پارلیمانی نظام لائیں گے اور پارلیمانی نظام جیسا کہ آپ کو معلوم ہے وہ تقسیم اختیارات کے نظم پر مبنی ہے۔ پھر یہ کہ مولانا مودودی نے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کے ضمن میں اپنی رائے جن دلائل کے تحت ظاہر کی، ان میں اضطرار اور وقتی ضرورت کو بنیاد بنایا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے بھی اپنی ایک تقریر میں اس بات کا اعتراف کیا کہ "میں جماعت اسلامی والوں کی ممنون ہوں کہ انہوں نے میری حمایت کی ہے۔ انہوں نے اس کو ایک اجتماعی ضرورت کے تحت اور ایک قابلِ قبول برائی کے طور پر تسلیم کیا ہے"۔ اس معاملے میں ہم نے کوئی مداہنت نہیں برتی، شریعت سے کوئی انحراف نہیں کیا، بلکہ اس کی صحیح پوزیشن بتا کر ہی ان کی حمایت کی۔

باقی جہاں تک آپ کے سوال کے دوسرے پہلو کا تعلق ہے بنگلہ دیش کے انتخابات ۱۹۹۱ء کے حوالے سے، تو اس ضمن میں چند گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔ بنگلہ دیش، سابق مشرقی پاکستان، جہاں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا، جہاں کے مسلمانوں نے تحریک آزادی اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں بے مثل حصہ لیا، بلکہ صوبہ سرحد اور پنجاب سے بھی زیادہ۔ اب اس خطے کو پاکستان کے داخلی تضادات کے ساتھ ساتھ ۲۴ سال بعد وہاں بسنے والے دس فیصد ہندوؤں اور کمیونسٹ پارٹی کے مضبوط کیڈر کی مدد سے بنگلہ قوم پرست عوامی لیگ نے اس کلائمکس پر پہنچا دیا کہ بھارت اور اشتراکی روس کی مشترکہ معاونت اور مغرب کی اعانت کے ذریعے اس حصے کو پاکستان سے کاٹ دیا گیا۔ لیکن وہاں کی مسلم آبادی بجا طور پر پہلے کی طرح اب بھی ہندو ذہنیت سے خائف ہے۔ جہاں ہندو اپنے دس فیصد ووٹوں کے ذریعے متحدہ شکل میں عوامی لیگ کی پشت پر ہیں۔ اب ان عام انتخابات میں ایک جانب عوامی لیگ کی حسینہ واجد تھیں، جو نہ صرف اعلانیہ بلکہ فکری سطح پر بھی بنگلہ دیش کو بھارت کی حاشیہ بردار ریاست کا درجہ دینے کی سعی کر رہی ہیں اور پاکستان سے شدید دشمنی کے جذبات رکھتی ہیں۔ مزید یہ کہ وہ مجموعی طور پر بنگلہ قومیت کی علم بردار اور مسلم قومیت کے کسی بھی تصور کی مخالف ہیں اور پھر ایک قابلِ لحاظ انتخابی قوت کی مالک بھی ہیں۔

اس کے مقابلے میں بیگم خالدہ ضیاء تھیں، جو ہندو ذہنیت کی چیرہ دستیوں کی کھلم کھلا نقاد، بھارت کی اجارہ داری کی برملا مخالف، پاکستان سے برادرانہ تعلقات کی حامی، مسلم دنیا سے روابط کی علم بردار اور مسلم قومیت کی طرف دار تھیں۔ وہ ہندو یا بھارت کی پشت پناہ عوامی لیگ کے مقابلے میں ایک مضبوط سیاسی قوت تو تھیں، لیکن مکمل اکثریت کی حامل نہیں۔ ایسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اضطراری کیفیت میں جماعت اسلامی بنگلہ دیش کا غیر جانبدار رہنا یا کسی تیسری قوت کی تائید میں جانا اور بیگم خالدہ ضیاء کی مخالفت کرنا واضح طور پر حسینہ واجد صاحبہ کی حمایت میں جاتا۔ اسی لیے جماعت اسلامی نے ہندو نواز سیکولر قوت کا راستہ روکنے کے لیے، وزارتوں کے بغیر اگر بیگم خالدہ ضیاء کی حمایت کی ہے تو بھلا اس میں کون سی غلطی کی ہے؟۔ وہاں کی مخصوص صورت میں جماعت اسلامی کے اس اقدام کو اگر یہاں کا کوئی سیاسی دانش ور یا صحافتی مفتی "موقع پرستی" باور کرتا ہے یا شرارت آمیزی میں دین داری کے خلاف گردانتا ہے تو لامحالہ اس کی فکری کج روی اور سیاسی دیانت پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس مثال کی بنیاد پر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس صورتِ حال کو عمومی درجہ دے کر یہاں پر بھٹو بیگمات کا حاشیہ بردار بنا جائے تو اس پر سخت افسوس ہوتا ہے۔ پیپلز پارٹی یا اس کی قیادت کو محترمہ فاطمہ جناح کی محدود عرصے کے لیے پیش کش یا بیگم خالدہ ضیاء کے ملک میں شدید اضطراری مجبوری پر کیسے محمول کیا جا سکتا ہے؟ جو نہ صرف تہذیبی اور فکری سطح پر، بلکہ عملی اعتبار سے بھی مغربی استعمار کی حلیف اور کئی پالیسیوں میں اس کی طرف دار ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ایسی طعنہ زنی نہایت سنجیدہ صحافتی حلقوں نے بھی کی ہے۔ کاش وہ خود بنگلہ دیش کے حالات کا بہ چشم سر جائزہ لے کر کوئی فتویٰ صادر فرماتے اور ان کے کالم نگار کٹ حجتی سے گریز کرتے۔

بھارت میں ہندو انتہا پرستی کا احیاء اور تحریک اسلامی

سوال: مسلم بنیاد پرستی کی جو لہر گزشتہ چند برسوں میں شدت پکڑتی جا رہی ہے، اس پر بھارت میں "بھارتیہ جنتا پارٹی" کی صورت میں ایک بڑا سخت رد عمل سامنے آیا ہے اور وہ یہ کہ "اگر دوسرے مذاہب اپنے سینکڑوں سال پرانے قوانین پر اصرار کرتے ہیں تو ہم ایسا کیوں نہ کریں؟" اس عمل اور رد عمل کے باعث آج بھی بھارت کے نہ صرف ہندو، بلکہ روشن خیال مسلم رہنما بھی سیکولرازم کو مذہبی ہم آہنگی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں، وگرنہ بھارت جیسی ریاست میں پندرہ کروڑ سے زائد مسلمانوں کا مستقبل اور گذشتہ ہزار برس کے تمام مسلم تہذیبی نشانات مٹ جانے کا شدید خطرہ ہے۔ اس صورت حال میں برعظیم پاک و ہند کے کچھ اہل نظر کی رائے کے مطابق کیا یہ مناسب

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہ ہو گا کہ برصغیر کے تمام مذاہب کے سرکردہ رہنما مل کر مذہبی بنیادوں پر سیاسی نظام نافذ کرنے پر اصرار کرنے کے بجائے سیکولر کلچر کو رواج دیں، مذہبی حوالے سے پر امن بقائے باہمی کو عام کریں، اور اسی حوالے سے اپنے مذاہب کی صرف تبلیغ و اشاعت اور محض رفاہ عامہ کا کام کریں اور بھارت میں یرغمال مسلمانوں کو بچانے اور ان کا مستقبل سنوارنے کا کام کریں؟

جواب: میرے بھائی، اگر یہی کام کرنا تھا تو پھر پاکستان بنانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ آپ کے سوال میں پوشیدہ یہ "ہمدردانہ مشورہ" قیام پاکستان کی ساری بنیادی اپروچ ہی سے متصادم ہے۔ یہ بات بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ بھارت میں جس چیز کو آپ "ہندو بنیاد پرستی" کہہ رہے ہیں اس کی تاریخ ولادت، شاید پاکستان میں اسلامی نظام کی بات یا اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے وجود میں آنے سے متعلق ہے۔ میں بڑے ادب سے کہوں گا کہ جو حضرات یہ بات کہتے ہیں وہ اس برصغیر کی تاریخ سے واقف نہیں۔ برصغیر میں "شدھی" کی تحریک انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی، جبکہ اس سے قبل "سنگھٹن" وغیرہ کی تحریکیں بھی "رام راج" کی پکار تھیں۔ سید احمد شہید کی تحریک جہاد جو برعظیم پاک و ہند میں مغربی استعمار اور "سکھا شاہی" کے لیے مزاحمت کی سب سے بڑی قوت تھی۔ اس تحریک کا توڑ کرنے کے لیے جو مختلف فتنے جنم دیے گئے، ان میں ایک قادیانیت کا فتنہ بھی تھا۔ مذہبی فرقہ پرستی کا فتنہ بھی تھا اور اسی تسلسل میں ہندو احیاء پرستی کا اقدام بھی تھا۔ انیسویں صدی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اور خصوصیت سے تحریک مجاہدین کے مقدمات اور ۱۸۸۴ء میں ان کا جو آخری مقدمہ ہوا اس میں آپ دیکھیں گے کہ یہ سب کچھ اس وقت پروان چڑھ چکا تھا۔ "دھرتی ماتا" کی محبت اور دھرم سے شیفتگی کے اس ہندو نعرے کی رہنمائی اور آبیاری انگریز نے کی تھی۔ اس وقت سے لے کر پہلی جنگ عظیم کے بعد تک ہندو بنیاد پرستی اور ٹھیٹ ہندو قوم پرستی سے سرشار پر تشدد تحریک اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف تشدد کا استعمال کیا۔ اسی دوران مسٹر گاندھی کے باطن میں چھپا ہوا برہمن بے نقاب ہوا تھا۔ یاد رہے کہ ۱۹۲۴ء سے پہلے برصغیر کی تاریخ میں مسلمانوں کے ۹۰۰ سالہ دور اقتدار اور انگریز کے سو سالہ دور میں کبھی ہندو مسلم فساد رونما نہیں ہوئے تھے۔

"بھارتیہ جنتا پارٹی" اس وقت وجود میں نہیں آئی تھی۔ لیکن "راشٹریہ سوامی سیوک سنگھ"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

(RSS) قائم ہوا اور یہ ان کی مسلح فورس تھی۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اس کے فکری لیڈروں میں تھے۔ جو پہلے پہل تو ہمارے ہندوستانی مسلم قائدین مولانا محمد علی جوہر، عبدالباری فرنگی محل، قائداعظم اور دوسرے اکابر مسلمانوں کے ممدوح تھے، "خلافت تحریک" کے ہمنوا بھی تھے، لیکن مسلمان قائدین کی وسعت قلبی اور وسیع المشربی بھی گاندھی جی اور موہن مالویہ جی کے ذہن میں جمے ہوئے اس برہمنی تعصب اور تنگ نظری کو نہ دھو سکی۔ یہ پارٹی ہندو مذہبی انتہا پرستی اور ہندو قوم پرستی پر مبنی تھی۔ پھر اس نے "جن سنگھ" کو جنم دیا اور آخر کار بھارتی جنتا پارٹی کا روپ سامنے آیا۔ اب اگر اپنے ہندو تعصب اور مسلمانوں سے نفرت کے ارتقاء کو یہ لوگ پاکستان میں اسلامی نظام کی تحریک کا ردعمل قرار دیتے ہیں، تو یہ ان کی علمی بددیانتی کا ثبوت ہے۔ لیکن جو مسلمان ان کی ایسی باتیں سن کر اسلامی احیاء کی تحریک کی مذمت کرتے ہیں تو دراصل وہ اپنے مطالعہ تاریخ کی نفی کرتے ہیں۔

آپ اس پس منظر میں پورے معاملے کو دیکھیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بھارت میں ہندو تعصب اور انتقام کی موجودہ لہر کا کوئی تعلق پاکستان کی تحریک نفاذِ اسلام کی ضد سے نہیں بلکہ یہ محض Anti Muslim تحریک ہے، جس کی جڑیں انیسویں صدی میں مضبوط کی گئی تھیں۔ ایک پہلو اور بھی قابل غور ہے۔ تمام اہم سیاسی تجزیہ نگار اس امر پر متفق ہیں کہ ہندو انتہا پسندی کی تازہ رو کو پروان چڑھانے میں خود اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کا غیر معمولی حصہ ہے۔ جنوبی بھارت میں مسلمانوں کی دعوتی سرگرمیوں کے نتیجہ میں نچلی ذات کے لوگ جب اسلام کی طرف متوجہ ہوئے تو خود اندرا گاندھی اور بھارت کی برہمن اسٹیبلشمنٹ نے اس دوران باقاعدہ ہندو انتہا پسندی کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ خصوصیت سے شمالی بھارت کی ہندو بیلٹ [پٹی] میں مسلم کش فسادات کی ایک رو چل پڑی۔ بابری مسجد کے مسئلہ کو اٹھایا گیا۔ مسلمانوں کے عائلی قوانین کو متنازع بنایا گیا اور محض سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے مذہبی تعصب کی فضا پیدا کی گئی۔ لیکن تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ کانگریس جس نے اس فضا کو پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا، وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکی اور اصل فائدہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو پہنچا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ہندوؤں نے اس بات کو محسوس کیا کہ اب ردعمل کے طور پر بھارتی مسلمانوں کا خود اپنے اوپر اعتماد بڑھ رہا ہے اور وہ اپنے ووٹ کا سیاسی دباؤ استعمال کر رہے ہیں۔ خاص طور سے بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے ۱۹۷۵ء میں جب ایمرجنسی لگائی۔ اس دوران مسلمانوں کی "نس بندی" کا مسئلہ بنیادی موضوع بنا۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف جدوجہد

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی اور مسلم ووٹ نے کانگریس کی پہلی شکست میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا۔ دراصل یہ وہ مقام ہے جہاں پر ہندو انتہا پسندی نے ایک خاص سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کی بھی فکری بنیادیں انیسویں صدی سے اٹھائی جارہی تھیں، اس لیے یہ چیز یکایک نہیں ہوئی۔

اسی طرح میری نگاہ میں یہ بہت لمبے عرصہ تک رہنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوازم میں اجتماعی معاملات کے لیے کوئی واضح تصور حیات موجود نہیں ہے۔ معاشرت اور عدل کے بارے میں ان کے ہاں کوئی قابل لحاظ رہنمائی نہیں ملتی۔ مجھے "رسائل و مسائل" میں سے مولانا مودودی کی وہ تحریر یاد آرہی ہے جس میں انہوں نے ایک ہندو سے یہ کہا تھا کہ اگر آپ کے پاس حقیقی الہامی مذہبی ہدایت موجود ہو اور آپ اس کے مطابق معاملات چلانا چاہیں اور فی الحقیقت اللہ کی بندگی پر مبنی کوئی راستہ اختیار کرلیں تو اس میں آپ کی خیر ہوگی، لیکن آپ کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے تو پھر آپ کو تعصب سے کام نہیں لینا چاہیے، بلکہ جس مذہب کے پاس الہامی ہدایت پر مبنی نظام زندگی موجود ہے اسے اختیار کرنا چاہیے، اسی میں انسانیت کی خیر ہے۔ دراصل یہی وہ شعور ہے جس پر پاکستان کی پوری تحریک وجود میں آئی۔

اگر ہمیں مجوزہ خوش نما سیکولرازم کے سائے تلے محض "مذہبی رواداری" کے نام پر کوئی نظام بنانا تھا، تو اس کے لیے ہمیں یہ پاکستان قائم کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر یہ بھی ایک معروضی حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب نے آج انسان، معاشرے، اسٹیٹ اور قوم کے جو تصورات دیے ہیں وہ ایک ایک کر کے منہدم ہو رہے ہیں۔ کمیونزم نے اس کے مقابلے میں جو بند کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ بھی تنکے کی طرح بہہ گیا۔ ان حالات میں وہ ہدایت، وہ اصول اور وہ نظام جس کی بنیاد پر انسانیت کے مسائل فی الحقیقت حل ہو سکیں، صرف اور صرف اسلام ہے۔ اسلام صرف پاکستانیوں کا دین نہیں ہے، اسلام پر محض نسلی مسلمانوں کی اجارہ داری نہیں ہے، بلکہ اسلام تو وہ پیغام ہے جو انسانیت کو زندگی، بقا اور تہذیب کا راستہ سکھانے کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہی ہمارا دعویٰ ہے اور یہی پیغام۔

آپ نے سوال میں ہندو انتہا پسندی کے علاج کے لیے جو دوا تجویز کی ہے وہ تو دراصل مسلمانوں کے پورے نظام کو دریا برد کرنے کے مترادف ہے۔ اسی لیے ہم تو اس نوعیت کی "ہمدردانہ اور دانش ورانہ" تجاویز کے باغی ہیں۔ گو آج کے انسان نے فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑنا اور سمندر میں مچھلیوں کی طرح تیرنا سیکھ لیا ہے، لیکن بدقسمتی سے زمین پر انسانوں کی طرح رہنا نہیں سیکھا۔ اسلام ہی دراصل زمین پر انسانوں کی طرح رہنا سکھاتا ہے اور ہم یہی معاشرہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ قائم ہو جاتا ہے تو پھر ان شاء اللہ اس کے اچھے اثرات بھارتی ہندوؤں پر بھی پڑیں گے اور وہاں کے مظلوم مسلمانوں اور مقہور بریجنوں پر بھی پڑیں گے۔ کیونکہ اسلام میں مذہبی رواداری کا ان لوگوں نے ابھی تک نظارہ نہیں کیا، بلکہ اس وقت جب کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ بھی نہیں ہے، تب بھی پاکستان کا اپنی اقلیتوں کے ساتھ رویہ کسی بھی دوسرے ایشیائی ملک سے بہتر، بلکہ بہت زیادہ بہتر ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصہ سوم

اسلامی تحریک کی قوت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آپ کے ان تمام سوالات * کا تعلق تربیت اور سیرت و کردار کی تعمیر سے ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختصراً تربیت اور تعمیر سیرت کے بارے میں اپنا زاویہ نگاہ واضح کر دوں، تاکہ باقی سوالات کے بارے میں بات سمجھنے میں آسانی ہو۔

سیرت دراصل شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ یہ فکر و عمل کی وہ کل کائنات ہے، جو خیال و ارادہ، جذبات و احساسات اور اعمال و عادات کے مستقل سانچوں سے عبارت ہو۔ تصورات، احساسات اور اعمال میں مقصدی یک رنگی سیرت کی مظہر ہے۔ اسلامی سیرت، زندگی کی اس کل شخصی کائنات پر صبغتہ اللہ کے غلبہ سے رونما ہوتی ہے۔ اور ایسی سیرت ہی کی تعمیر کی جدوجہد کا نام تربیت ہے۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں تزکیہ کہا جاتا ہے، جو بعثت انبیاء علیہم السلام کا ایک بنیادی مقصد رہا ہے۔ ہمارا تصوّر تربیت جن حقائق پر مبنی ہے، وہ "سیرت" کی تعریف سے آپ سے آپ واضح ہو جاتے ہیں۔

الف: سیرت کا تعلق محض رویہ سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ فکر، جذبات اور اعمال ان تینوں پر محیط ہے اور ان کے ایک مقصدی سلسلے میں منسلک ہو جانے سے رونما ہوتی ہے۔

ب: سیرت، زندگی کے کسی ایک یا چند مخصوص گوشوں سے متعلق نہیں، بلکہ پوری شخصیت

---

*

۱. معاشرے میں فرد کے سیرت و کردار کی کیا اہمیت ہے؟
۲. اخلاقی زوال کے کیا نتائج ہوتے ہیں؟
۳. انگریزوں کی غلامی نے ہمارے قومی کردار میں کن خرابیوں کو جنم دیا؟
۴. مجموعی قومی کردار کی تعمیر کے لیے مؤثر تدابیر کون سی ہیں؟
۵. آج کے بگڑے ہوئے ماحول میں اپنے کردار کی تعمیر، بلکہ حفاظت کی خاطر اجتماعی زندگی سے علاحدگی کا رجحان آپ کی نظر میں کیا ہے؟
۶. تربیت کی اصل بنیاد خود اپنا ارادہ و کوشش ہے، اسے مسلسل بیدار رکھنے کے لیے کیا کیا جانا چاہیے؟
۷. انفرادی سیرت کی تعمیر کے لیے تحریک اسلامی کون سے مواقع فراہم کرتی ہے اور ان سے کماحقہٗ مستفید ہونے کے لیے ایک فرد کو کیا کرنا چاہیے؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر حاوی ہے۔ تنہائی میں دل میں پیدا ہونے والے خیالات سے لے کر دوسرے انسانوں سے معاملات کرنے تک، ہر چیز اس میں شامل ہے۔ زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ سیرت کا تعلق پوری زندگی اور شخصیت سے ہے۔ کوئی پہلو اور کوئی گوشہ اس کے دائرے سے باہر نہیں۔ اسلام پوری زندگی کو انفرادی اور اجتماعی، نجی اور معاشرتی، عائلی اور سیاسی، معاشی اور ملکی، قومی و بین الاقوامی قوانین، روایات اور ضوابط کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے:

یاایھاالذین آمنوا ادخلوا فی السلم کا فتہ ولا تتبعوا خطوات الشیطان۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے، اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو (یعنی زندگی کو خانوں میں تقسیم کرنا)۔

ج: سیرت کی یہ تعمیر زندگی کی کشمکش کے درمیان ہوتی ہے، کسی گوشہ تنہائی میں نہیں، سیرت زندگی سے فرار سے نہیں۔ زندگی کی تعمیر سے بنتی ہے۔ جس طرح انسان پانی میں اترنے کے بعد ہی تیرنا سیکھتا ہے، اسی طرح کشمکش حیات کے دوران ہی انسان کی شخصیت اور سیرت کی تعمیر و ترقی کا شجر سایہ دار پھلتا اور پھولتا ہے۔

د: سیرت کا محل فرد کا اپنا دل ہے۔ اس کی زندگی، اس کی اصلاح اور اس کی صورت گری اصل مطلوب ہے۔ اگر یہ سنور جائے تو پوری زندگی سنور جاتی ہے۔ اور اگر یہ اصلاح قبول نہ کرے تو اصلاح کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھ پاتا ہے۔ سچ کہا سب سے سچے انسان ﷺ نے:

"خبردار! بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ کہ جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے۔ اور وہ بگڑ جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ ہوشیار کہ وہ (گوشت کا لوتھڑا) دل ہے۔"

ان حقائق کی روشنی میں، میں اب آپ کے سوالات کو لیتا ہوں۔

ا

معاشرے میں فرد کے سیرت و کردار کی کیا اہمیت ہے؟

معاشرے میں فرد کی سیرت و کردار کی اہمیت کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھ لیں کہ معاشرہ ہے کیا؟

معاشرہ انسانوں کے اس مجموعہ کا نام ہے جو باہم مل جل کر ساتھ رہنا چاہتے ہوں۔ جو مختلف نظریاتی، تاریخی یا تہذیبی تعلقات کی بدولت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں۔ بنیادی طور پر دو چیزیں معاشرہ کی اساس ہیں:

الف۔ افراد کا مجموعہ۔

ب۔ ان کا احساس کہ ہمیں ساتھ رہنا ہے۔

اسباب، وجوہ اور محرکات خواہ کچھ بھی ہوں، اگر معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے، تو پھر جیسے افراد ہوں گے، ویسا ہی معاشرہ بھی ہوگا۔ کھوٹے سکوں کا خواہ کتنا ہی بڑا انبار ہو، وہ کھوٹے ہی رہیں گے۔ کانٹوں کی تعداد خواہ کتنی ہی ہو، ان میں گلوں کی خوشبو پیدا نہیں ہو سکتی۔ پتھر جس تعداد میں بھی جمع کر دیے جائیں وہ سنگ ہی رہیں گے ہیرے نہیں بن سکتے۔ اس لیے معاشرے کا حسن اور توازن قائم ہی اس وقت ہو سکتا ہے، جب ہر فرد یا کم از کم افراد کی ایک معقول اور مؤثر تعداد کی انفرادی سیرت اچھی ہو۔

دوسری اہم تر بات یہ ہے کہ تاریخ سب سے اہم قوت اجتماع نہیں، افراد ہیں۔ زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کا انحصار افراد، ان کے تصورات اور ان کی جدوجہد پر ہے۔ اجتماع (Social Order) کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن آخری تجزیہ میں اس کی قسمت کا انحصار افراد ہی پر ہے۔ اگر فرد اور معاشرہ میں ہم آہنگی ہے تو وہ دونوں کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ اور اس کے نتیجے میں ایک صحت مند تہذیب بھی رونما ہوگی۔ کسی معاشرے میں کوئی تبدیلی مقصود ہو تو ایسی تبدیلی بھی افراد ہی کی مساعی سے ہوتی ہے اور اجتماع کا رنگ بدل جاتا ہے۔ یہ کام وہی لوگ انجام دیتے ہیں جو مضبوط سیرت کے حامل ہوں اور خود اجتماع کے رنگ میں رنگنے کی بجائے اس کے رنگ کو بدل ڈالنے کا عزم رکھتے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ افراد کی سیرت و کردار معاشرے کی اصلاح اور تاریخ کی تعمیر میں بڑا اہم اور مثبت رول ادا کرتے ہیں۔

پھر اگر آپ اسلامی تعلیمات پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اسلام نے معاشرے کو بدلنے اور اسے صحیح خطوط پر تعمیر کرنے کی ذمہ داری فرد پر عائد کی ہے۔ اور ہر فرد کو اللہ تعالیٰ کے سامنے انفرادی طور پر جواب دہ قرار دیا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسی طرح اگر آپ سیرت سازی کے عمل پر غور کریں گے تو پائیں گے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ عمل انفرادی ہے۔ اس میں فرد کا ارادہ اور اس کی مساعی ہی اصل فیصلہ کن چیز ہیں۔ اجتماعی ماحول مددگار بھی ہو سکتا ہے اور مانع بھی، لیکن سب سے اہم قوت فرد کی سعی و جہد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ایک اچھا معاشرہ چاہتے ہیں، تو اس کا انحصار افراد ہی کے سیرت و کردار پر ہوگا۔

فرد کی اہمیت کے ان تمام پہلوؤں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ جہاں تک میں نے سیرت طیبہ ﷺ کا مطالعہ کیا ہے، مجھے اس سے یہی پیغام ملا کہ زندگی کے دھارے کو موڑنے کے لیے پہلا قدم افراد کی تیاری اور تربیت ہے۔ البتہ چونکہ یہ فرد ایک خاندان، ایک محلہ، ایک سوسائٹی، ایک ریاست اور ایک تہذیب کی آغوش میں جنم لیتا اور ترقی کرتا ہے، اس لیے مکمل اصلاح کے لیے ان تمام اداروں کا بھی اس مقصد اور مشن سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی درجے میں فرد کی زندگی اور اس کی شخصیت کے ابھار، تعمیر اور تشکیل کو متاثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد کی اصلاح کے ساتھ ان افراد کو دعوت و ارشاد، اجتماعی اصلاحی جدوجہد اور معاشرہ اور ریاست کے اداروں کی تعمیرِ نو کا ہدف دیا جائے، تاکہ اس جدوجہد کے نتیجہ میں مکمل اصلاح رونما ہو سکے۔ اور یہی اصل مطلوب ہے۔

۲

اخلاقی زوال کے کیا نتائج ہوتے ہیں؟

اخلاقی زوال کے نتائج کی پوری فہرست مرتب کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کا پہلا نتیجہ ایسا ہے کہ وہ سب کچھ لے ڈوبے اور وہ ہے تباہی، فرد اور معاشرہ کی، دنیا اور آخرت میں۔ آپ شاید اس سے تو اتفاق کریں کہ:

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے، انہی اجزا کا پریشاں ہونا

اور یہ ترتیب، بلکہ حسن ترتیب، اخلاق کی قوت کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ اس کے کمزور ہونے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر انتشار بپا ہو جاتا ہے۔ یہ اصول فرد اور معاشرہ دونوں کے بارے میں صادق آتا ہے۔

۳

انگریزوں کی غلامی نے ہمارے قومی کردار میں کن خرابیوں کو جنم دیا ہے؟

یہ پوچھیے، کہ کون سی خرابی کو جنم نہیں دیا؟--- غلامی خود ام الخبائث ہے۔ اس میں زندگی صرف "جوئے کم آب" ہی نہیں بن جاتی بلکہ اس کا صاف و شفاف پانی بھی زہر آلود ہو جاتا ہے۔ یہ فرد اور قوم دونوں کی خودی کو مغلوب، مضمحل اور بالآخر مردہ کر دیتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ نقالی، بہروپیا پن اور نفاق کو جنم دیتی ہے۔ گ سیاسی غلامی معاشی محکومی کے پھندے تیار کرتی ہے۔ ان دونوں کے جلو میں معاشرتی تقلید رونما ہوتی ہے۔ پھر اخلاقی استیلا اور ذہنی انتشار کا آغاز ہوتا ہے اور ایک زندہ قوم تمدنی موت مر جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے صحیح کہا تھا کہ:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

دور غلامی میں ہمارا سابقہ جس دشمن سے تھا، اس نے ہماری قوم کو ان امراض میں مبتلا کر دیا، جو آج اس کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ میں یہاں چند ایک کا ذکر کرتا ہوں:

۱۔ ذہنی پراگندگی

ہمیشہ سے مسلمانوں کی ایک خصوصیت، اسلام کے بارے میں ذہنی یکسوئی رہی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں ہمیں اس سے محروم کر دیا گیا۔ اور ذہنی و فکری طور پر انتشار، بے اطمینانی اور تشکیک کی کیفیت پیدا کر دی گئی --- یہ صورت، آزادی کے بعد بھی جاری ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے سیاسی آزادی کے باوجود ذہنی اور تہذیبی غلامی سے آزادی حاصل نہیں کی ہے۔

15818

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۲۔ نفاق

قوم میں زندگی کے ہر شعبہ میں نفاق اور قول و عمل کی عدم مطابقت رونما ہو گئی ہے۔ اس روگ نے ہماری اخلاقی قوت کو ختم کر دیا ہے۔ پھر اس کے شاخسانہ کے طور پر ایک اور چیز بھی رونما ہوئی ہے یعنی خوشامد --- صلاحیت (Merit) کے مقابلہ میں خوشامد، سفارش اور اقربا پروری کا مرض بھی بڑے پیمانے پر رونما ہوا ہے۔

۳۔ اجتماعی اداروں کی تباہی

سیاسی اقتدار سے محرومی کے بعد سامراجی حکمرانوں نے ہمارے ان تمام اداروں (Institutions) کو تباہ کیا جو ملت اسلامیہ کے شیرازہ کو منضبط کیے ہوئے تھے۔ پہلی ضرب فوجداری قانون پر پڑی اور پھر دیوانی قانون پر۔ اس کے بعد معیشت، عدالت، اور انتظامیہ سے مسلمانوں کی تطہیر کی گئی۔ ساتھ ہی مغربی قانون اور ادارے کو ہمارے معاشرہ پر مسلط کرنے کا کام ہوا۔ اس کے ساتھ تعلیم کا نظام یکسر بدلا گیا اور بالآخر ضرب خود خاندان کے نظام پر پڑی جو ہمارا آخری حصار تھا۔ جدید سیاسی محکومی کے دور کا ایک بڑا ہی تباہ کن نتیجہ مسلم معاشرے کے اداروں کا انہدام اور ان کی جگہ معاشرہ پر جبر کے ذریعے مغربی قوانین اور اداروں کو مسلط کرنا ہے۔

۴۔ فاسق قیادت

مسلمانوں کی یہ بھی ایک خصوصیت رہی ہے کہ ان کی حقیقی قیادت، ہمیشہ اہل خیر کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ اگر سیاسی غلبہ بے کردار لوگوں کو حاصل ہو بھی گیا تو زندگی کے دوسرے تمام شعبوں میں صالح افراد ہی مرجع خلائق رہے ہیں۔ اس طرح اجتماعی امور میں بھی دلوں پر حکومت کرنے والے علمائے حق اور صلحائے امت ہی تھے۔ دور غلامی میں جو انقلاب معکوس آیا ہے، اس کے نتیجہ میں علماء و صلحاء اجتماعی زندگی میں قیادت کے منصب سے گویا ہٹا دیئے گئے ہیں۔ اکثر شعبوں میں تو جن لوگوں کے ہاتھ میں قیادت آئی ہے، ان کی زندگیاں اسلام کے معیارِ قیادت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی ہیں۔ اس چیز نے پوری امت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں ہمارے بہت سے مسائل کی جڑ یہی کشمکش ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۵۔ مغرب کا تمدنی غلبہ

یورپ کی کورانہ نقالی کا مرض بھی انگریزوں کی غلامی ہی کی پیداوار ہے۔ مغربی استعماری قوتوں کے تمدنی غلبے (Cultural Imperialism) کی پالیسی کی کامیابی کا ایک مظہر یہ چیز بھی ہے، جو اپنے نتائج کے اعتبار سے ایک قوم کی تخلیقی صلاحیتوں کے لیے پیغام موت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کبھی اسے اپنی حقیقی قامت (Stature) حاصل نہیں کرنے دیتی۔

۴

"مجموعی قومی کردار کی تعمیر کے لیے موثر تدابیر کون سی ہو سکتی ہیں"؟

میری رائے میں اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ ہماری قوم کی جو امتیازی حیثیت اور اس کا جو تاریخی مزاج ہے، وہ مشخص کیا جائے۔ اور وہ ہے اسلام

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی ﷺ

فی الحقیقت اسلام ہی ہماری بنیاد ہے۔ اسلام ہی ہمارا ملی نصب العین ہے اور اسلام ہی ہمارے لیے کردار ساز قوت ہے —— ہماری نگاہ میں سیرت سازی کے لیے نصب العین کا مسئلہ سب سے اہم اس لیے ہے کہ اسلام اسے بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ سیرت کے بغیر مجموعی قومی کردار کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ کون سا کردار ہمیں مطلوب ہے، اس وقت تک کردار سازی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت عملی طور پر حالت یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی نصب العین اور واضح سمت ترقی (Direction) نہیں ہے۔ لے دے کے ایک معاشی ترقی کا ڈھونگ، نعروں اور الٹا معاشی محکومی کی شکل میں ضرور رچایا جا رہا ہے۔ لیکن پاکیزہ قومی کردار کی تعمیر کے نقطۂ نظر سے اس سے زیادہ نقصان دہ "نصب العین" کوئی نہیں ہو سکتا۔ معاشی ترقی ہمیں ضرور مطلوب ہے۔ لیکن اسلامی احیاء کے ایک جزو کی حیثیت سے چاہیے، مطلوب فی الذات کی حیثیت سے نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پر قومی کردار کیسے تعمیر ہو۔ ہمارے نزدیک میں اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے اہم ذرائع یہ ہیں:

۱۔ نظامِ تعلیم کی اصلاح

میری نگاہ میں آغاز کار کے لیے یہ سب سے اہم اقدام ہے کہ نظامِ تعلیم کو اسلام کے رنگ میں رنگا ہوا ہونا چاہیے، تاکہ ہماری زیرِ تعلیم نسلیں دین اسلام کو اپنی انفرادی اور قومی زندگی کے اصل نصب العین کی حیثیت سے شعوری طور پر قلبی اطمینان کے ساتھ قبول کریں۔

۲۔ مساجد کی بنیادی اور سماجی حیثیت

ضرورت اس امر کی ہے کہ مسجد کے ادارے کا تاریخی کردار بحال کیا جائے، اسے مسلمانوں کی دینی اور سماجی زندگی کا گہوارہ بنایا جائے مثلاً ابتدائی تعلیم، تعلیم القرآن، تعلیم بالغاں، خدمتِ خلق، بلند پایہ دارالمطالعے اور لائبریریاں، محلہ سدھار، اخلاقی تعمیر، انسداد غنڈہ گردی اور فحاشی کا خاتمہ، مظلوم کی دادرسی اور ان کے حقوق کے تحفظ جدوجہد، حقوق العباد کا احترام یہ تمام کام مساجد کے ذریعے منظم طور پر کیے جاسکتے ہیں۔ اور انہیں مسجد کے ذریعے کیا جانا چاہیے۔

۳۔ دینی تعلیم و تربیت کا نظام

یہ انتظامات صرف طلبہ ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری قوم کے لیے ہوں۔ اس کے لیے یہ اقدام کیے جاسکتے ہیں:

الف۔ بنیادی اسلامی معلومات کو مرتب کرنا اور انہیں عوامی تعلیم (Mass Education) کے اصول پر پوری آبادی تک پہنچانا۔

ب۔ اخبارات ورسائل اور ریڈیو ٹیلی ویژن وغیرہ کے ذریعے دینی، اخلاقی اور قومی تعلیم کا خصوصی انتظام۔

ج۔ بڑے پیمانے پر دینی اور اصلاحی لٹریچر کی تیاری، جو ملک کی تمام مقامی زبانوں میں ہو۔ جس کا محور اسلام کی بنیادی تعلیمات، اور اسلامی تہذیب ہوں۔

د۔ ملک بھر میں حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کا انتظام۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۴۔ تاریخ اور روایت سے تعلق

قومی کردار کی تعمیر میں اپنی تاریخ سے واقفیت، سلف صالحین سے والہانہ محبت اور ماضی کے کارناموں پر بجا طور پر فخر بھی بے حد ضروری ہے۔ کوئی قوم اپنے ماضی سے گہرے ربط کے بغیر قومی حیثیت سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن اقوام کا کوئی ماضی نہ تھا انہوں نے ایک ماضی تصنیف کر لینے میں کسی پس و پیش سے کام نہ لیا —— جبکہ ہمیں اپنے ماضی سے گہرا ربط قائم کرنے کے لیے تاریخی اور دستاویزی کتب سے مل سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے آسان زبان میں تاریخ کے اہم واقعات کی تدوین، افسانوں، کہانیوں اور تاریخی نظموں کے ذریعے ماضی کے ولولہ انگیز واقعات کا بیان، تاریخی نمائشوں اور گشتی نمائش گاہوں (Mobile Exhibitions) وغیرہ کے ذریعے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم ویسے تو اپنی پوری تاریخ کو پیش کریں۔ لیکن سب سے زیادہ اہمیت دور رسالت مآب ﷺ اور خلافتِ راشدہ کو دیں۔ اور سیرتِ پاک ﷺ اور سیرت صلحاء کو اس پورے پروگرام میں مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ اب تک مسلمانوں کو جس چیز نے جوڑے رکھا ہے، وہ حضور پاک ﷺ کی ذات اور سیرت پاک سے اس کا تعلق ہے۔ آج یہ تعلق کمزور ہو رہا ہے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری ملی تعمیر کا انحصار ہمیشہ اس پر ہو گا کہ حضور اکرم ﷺ سے ہمارا تعلق کتنا گہرا اور کتنا مضبوط ہے یہی اس کا ذریعہ ہے اور یہی اس کا پیمانہ

مصطفیٰ بہ رساں راہ کہ ایں ہم اوست
اگرچہ او نبہ رسدی تمام بولہبی ست

۵۔ نظامِ قانون کی اصلاح

اگر ایک قوم کی اخلاقی قوت وہ جوہری قوت رہے جو اس کی زندگی کی گاڑی کو چلاتی ہے۔ اس اعتبار سے قانون کی حیثیت گیر (Gear) اور بریکوں (Brakes) کی ہے، جن کے ذریعے اس کے پورے نظام اور کارکردگی کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ہمارا پورا نظامِ قانون تبدیلی چاہتا ہے۔ اور جب تک اسے اسلامی مزاج اور قرآن اور حدیث کے احکامات سے ہم آہنگ نہ کر لیا جائے، قومی کردار کی تعمیر کا کام صحیح خطوط پر ٹھیک رفتار سے انجام نہ پا سکے گا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۶۔ اسلامی حکومت کا قیام

اسلامی حکومت کا قیام بجائے خود اس مقصد کے لیے ضروری ہے، جس میں قیادت کی حیثیت اس گاڑی کے ڈرائیور کی سی ہے۔ اس خاص سمت میں قوم کو لے جانے کی ذمہ داری قیادت ہی پر عائد ہوتی ہے۔ اسلام اس وقت تک یہاں زندہ حقیقت نہ بن سکے گا، جب تک ہمارے ملک میں صحیح اسلامی قیادت نہیں ابھرتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں کے ساتھ جو انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا ہے تو اس کی حکمت یہ بھی تھی کہ اصلاح اور تعمیر کا کام صحیح لیڈر شپ کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔

۵

آج کے بگڑے ہوئے ماحول میں اپنے کردار کی تعمیر بلکہ حفاظت کی خاطر اجتماعی زندگی سے علیحدگی کا رجحان آپ کی نظر میں کیسا ہے؟

اجتماعی زندگی سے علیحدگی مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ اوّل تو یہی محل نظر ہے کہ اس طریقہ پر عمل پیرا ہو کر کردار کی حفاظت کی بھی جا سکتی ہے۔ یہ راہ تو اعتراف شکست ہے اور اس سے کبھی کردار کی تعمیر واقع نہیں ہو سکتی۔ پھر جب اصل میدانِ کار آپ نے چھوڑ دیا، تو ترقی کے مواقع باقی کہاں رہے؟ ہو سکتا ہے کہ انفرادی اخلاق کی حد تک آپ اپنے کو کچھ بچا بھی لیں۔ لیکن اجتماعی اخلاق کے وسیع دائرے کا آپ کیا کریں گے؟ تعمیر کردار کا موقع اور اس کا اصل امتحان تو آزمائش اور بگاڑ کے خلاف جدوجہد میں ہے۔ اس کے برعکس اگر علاحدگی کے اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے تمام اچھے انسان معاشرے کو چھوڑ کر چلے جائیں، تو پھر معاشرہ کے لیے کیا رہ جائے گا؟۔ بدترین انسان! —— اس طرح تو آپ خیر اور اصلاح کے سرچشموں ہی کو بند کر دیں گے اور دنیا کو ہوس کے بندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے۔ ذرا سوچیے کہ اس میں پایا کیا اور کھویا کیا؟۔

اس لیے بگڑے ہوئے ماحول سے نمٹنے کے لیے صحیح طریقہ فرار نہیں، ٹکراؤ ہے۔ گوشۂ عافیت تلاش کرنے کی بجائے بگاڑ سے ٹکر لیجیے۔ علم، دلیل، متانت، کردار اور عمل سے اس کے ساتھ جنگ لڑیے، زندگی کے ایک ایک میدان میں اس سے پنجہ آزمائی کیجیے۔ اسے اپنے لیے ایک چیلنج سمجھیے اور اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیے۔ یہی ہے جہاد کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حقیقت ہے اور یہی ہے سب سے اعلیٰ درجے کا مجاہدہ۔

ایک مرتبہ آپ بگاڑ کو مصیبت کی بجائے چیلنج سمجھ لیجیے، پھر سنگِ راہ، سنگِ میل بننے لگیں گے، رکاوٹیں مہمیز کا کام کریں گی، آزمائشیں ترقی درجات کے مواقع کا روپ دھار لیں گی، مشکلات دعوتِ عمل دیں گی اور مزاحمتیں ولولہ جہاد میں اضافہ کا باعث ہوں گی۔

٦

تربیت کی اصل بنیاد خود اپنا ارادہ و کوشش ہے، اسے مسلسل بیدار رکھنے کے لیے کیا کیا جانا چاہیے؟

اگرچہ تربیت کی اصل بنیاد انفرادی ارادہ اور کوشش ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ معاشرہ اور ماحول بھی ایک مؤثر قوت ہیں، جنہیں کلی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اچھا ماحول معاون و مددگار ہوتا ہے اور برا ماحول رکاوٹ، الا یہ کہ آپ اس سے ٹکر لیں اور اس کی اصلاح کی جدوجہد کریں۔

تعمیرِ سیرت کا یہ عمل انفرادی احساس اور جدوجہد ہی سے عبارت ہے اور چونکہ یہ پوری زندگی پر محیط ہے اس لیے ارادے کو مستقلاً زندہ اور بیدار رکھنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے طریقے بے شمار ہیں، میں صرف چند کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

۱۔ تعمیر سیرت کا احساس --- یہ احساس ہر دم تازہ رہے کہ ہماری زندگی کا سب سے اہم کام تعمیر سیرت کی کوشش کاوش ہے۔ لیکن کبھی یہ جذبہ نہ پیدا ہونے دیجیے کہ آپ "بہت کچھ" بن گئے ہیں۔ نظر ہمیشہ بلندیوں پر رکھیے --- اس طرح آپ ہمہ وقت اس کام کی طرف متوجہ اور مصروف رہیں گے۔

۲۔ خدا کی یاد --- شعوری طور پر، خدا کو بھولنے کا اولین نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خود اپنی حقیقت سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ یہ بے خبری اور غفلت، تعمیر سیرت کے لیے موت ہے --- ولاتکونوا کل الذین نسوالله فانساهم انفسهم: اور (ان) لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا تو اللہ نے خود اپنے سے ان کو بے خبر کر دیا" ---

--- بلکہ آپ کی کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ: یذکرون الله قیاماً وقعوداً وعلی جنوبهم ویتفکرون خلق السموٰت والارض جو خدا کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اور آسمان اور زمین کی صنعت پر غور کرتے ہیں"۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۳۔ عبادات کا اہتمام --- عبادات ادا تو آپ کرتے ہی ہیں، شعوری طور پر ایمان اور احتساب کے ساتھ ان کو ادا کرنے کا اہتمام کیجیے۔ اس سے وہ تزکیہ کا ایک مؤثر ذریعہ بن جائیں گی محض عادات نہیں رہیں گی۔

۴۔ محاسبہ --- انفرادی طور پر اور جب ممکن ہو تو اجتماعی طور پر بھی --- محاسبہ کی حیثیت اس صیقل کی سی ہے جو زنگ کو دُور کر دیتا ہے، خصوصیت سے روزانہ رات کو سونے سے قبل چند منٹ میں دن بھر کی پوری کارگزاری کا جائزہ لیجیے، اس ایک چیز کو آپ تعمیر سیرت کے لیے اکسیر پائیں گے۔

۵۔ مطالعہ --- خصوصیت سے قرآن، حدیث، سیرت اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ زندگی کا جز بنائیں۔

۶۔ ان چیزوں سے اجتناب جو خدا سے غافل کرتی ہے --- خواہ ان کا تعلق کثرت مال سے ہو، یا بُری کتابوں کے مطالعہ سے، یا بد کردار لوگوں کی صحبت سے، یا فضول اور لایعنی کاموں سے۔

۷۔ غلبہ حق کی جدوجہد --- اسے زندگی کا محض ایک کام نہیں بلکہ اصل کام، اپنی مصروفیات کا ایک جزو نہیں بلکہ اصل مصروفیت اور مصروفیاتِ حیات کا ایک ضمیمہ نہیں اصل کیریر (Career) ہونا چاہیے۔ اسے یہ مقام دے دیجیے پھر ہر لمحہ آپ تعمیر سیرت کی جدوجہد میں مصروف ہوں گے۔ اور دنیا کی ہر چیز آپ کو ماجھنے، سنوارنے اور درست کرنے میں مددگار بن جائے گی۔ کوئی چیز آپ کی معاون بن کر یہ کام کرے گی اور کوئی مزاحم بن کر، لیکن ان شاء اللہ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوگا: تعمیر سیرت اور غلبہ حق۔ و کلمتہ اللہ ہی العلیا

۷

انفرادی سیرت کی تعمیر کے لیے اسلامی تحریک کون سے مواقع فراہم کرتی ہے اور ان سے کما حقہ، مستفید ہونے کے لیے ایک فرد کو کیا کرنا چاہیے؟

میرے خیال میں آج یہ مواقع اسلامی تحریک ہی فراہم کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ تعمیر سیرت کے لیے دو چیزیں درکار ہیں (۱) خدا سے صحیح ربط و تعلق اور (۲) خدا کے کلمہ کو غالب کرنے کے لیے جدوجہد میں انہماک۔ یہ دونوں چیزیں آپ کو اسلامی تحریک ہی میں مل سکتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ جو دینِ حق کو قائم کرنے کی عظیم جدوجہد میں مصروف ہے۔ میں اس بات کی وضاحت کرتا ہوں:

الف۔ سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تحریک آپ کو ایک مقصد کے لیے یک سو اور مطمئن کر دیتی ہے۔ اس کے بغیر زندگی میں شتر گربگی تو ہو سکتی ہے، لیکن مقصدی یک رنگی نہیں ہو سکتی، جو سیرت کی اصل بنیاد ہے۔

ب۔ اسلامی تحریک ہی یہ احساس جاگزیں کرتی ہے کہ تم کو سیرت کی تعمیر کی خصوصی کوشش کرنی ہے۔ کیونکہ (۱) بحیثیت مسلمان تمہارے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی کا راستہ اور حقیقی فلاح و سعادت کے حصول کا ذریعہ یہی ہے۔ اور (۲) تحریکِ اسلامی کے کارکن کی حیثیت سے دنیا تمہارے پیغام کو تمہاری زندگیوں سے جانے اور پہچانے گی۔ تمہاری کتابیں تو وہ بعد میں پڑھے گی، تمہاری کتابِ زندگی پہلے دیکھے گی۔

ج۔ اسلامی تحریک نیکی اور بھلائی کے جذبات زندہ رکھنے والے مطالعہ کے مواقع فراہم کرتی ہے اور کامیاب اسلامی زندگی کے خط و خال کو اجاگر کرتی ہے، تاکہ آپ اس معیار سے قریب تر آ سکیں۔

د۔ آپ کو بہتر اجتماعی فضا اور پاکیزہ ماحول دیتی ہے۔ جہاں آ کر آپ اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ جہاں آپ کو حقیقی رفاقت ملتی ہے۔ جہاں سب ایک ہی راہ کے راہی، ایک ہی قافلہ کے ساتھی اور ایک دوسرے کے لیے سہارا ہیں، جہاں گرتوں کو تھاما جاتا ہے، سست رفتار چلنے والوں کو تیز گامی ملتی ہے --- یہ طالبانِ خیر کی ایک چھوٹی سی دنیا ہے --- اور تعمیر سیرت کے لیے بہترین میدانِ کار۔

ہ۔ پھر یہاں آپ ایک باقاعدہ نظم، ایک نظام امر وابستہ ہوتے ہیں اور یہ نظم تربیت کا ایک بڑا موثر ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس سے انسان کی پوری زندگی میں نظم و ترتیب اور منصوبہ بندی کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ چیز تعمیر سیرت کی جدوجہد میں بڑی معاون ہے۔

و۔ تحریک اسلامی انفرادی اور خصوصیت سے اجتماعی محاسبہ و تنقید کا بہترین ادارہ اور فورم فراہم کرتی ہے۔ یہاں انفرادی محاسبہ کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ اور اجتماعی احتساب کے ذریعہ ایک دوسرے کو چوکس رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اسلامی تحریک کے مخالفین اپنی تنقید اور بے لاگ نشتر زنی کے ذریعے ہمیں چوکنا اور بیدار رکھتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہم اپنے کو اسلام کے معیار مطلوب سے قریب تر لانے کی کوشش تیز کر دیتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ز۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی تحریک اس قافلۂ حق کے راہیوں کو اس معرکہ حق و باطل میں لاتی ہے۔ یہ کارزار سیرت کے لیے وہی مقام رکھتا ہے جو سونے کو کندن بنانے کے لیے سنار کی بھٹی۔

گویا اسلامی تحریک میں آپ کا ہر کام تعمیر سیرت کی کتاب کا ایک ورق ہے۔ معاملہ خواہ مطالعہ کا ہو یا درس و تدریس کا، تحریر کا ہو، یا تقریر کا، کاروبار کا ہو، یا معاملات کا، اپنے نصب العین کے لیے ملاقاتوں کا ہو یا اسلامی تحریک کی یا کسی ضرورت مند کی مالی اعانت کا —— ان میں سے ہر ایک امتحان گاہِ حیات کا ایک پرچہ ہے اور ترقیِ درجات کا ایک موقع۔ بشرطیکہ اس سے کوئی فائدہ اٹھائے۔

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹۔۔۔ جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر 15818

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

چند اردو کتب اور جرائد

پاکستان میں نفاذ اسلام	خورشید احمد	۱۲۰ روپے
پاکستان، بھارت اور عالم اسلام	خورشید احمد	۸۰ روپے
جمہوریت، پارلیمنٹ اور اسلام	خورشید احمد	۲۱۰ روپے
پاکستانی سیاست اور آئین	خورشید احمد	۲۱۰ روپے
روداد قفس جلد اول	سید علی گیلانی	۱۲۰ روپے
روداد قفس جلد دوم	سید علی گیلانی	۱۲۰ روپے
کشمیر: نوائے حریت	سید علی گیلانی	۹۰ روپے
کشمیر: آزادی کی جدوجہد	مرتبہ: سفیر اختر	۲۵۰ روپے
مسئلہ کشمیر: کل، آج اور کل	مرتبہ: سلیم منصور خالد	۹۵ روپے
مسئلہ کشمیر: پاک، بھارت مذاکرات	مرتبہ: ارشاد محمود	۵۰ روپے
حرمت ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام	محمود احمد غازی	۳۵ روپے
ربا اور بنک کا سود	یوسف قرضاوی	۴۰ روپے
جدید اقتصادی مسائل اور شریعت	البرکہ بنک	۳۰ روپے
اسلامی بنکاری: نظریاتی بنیادیں اور عملی تجربات	اوصاف احمد	۳۵ روپے
ماہ نامہ "عالم اسلام اور عیسائیت"	مدیر: سفیر اختر (سالانہ)	۱۰۰ روپے
دوماہی "وسطی ایشیاء کے مسلمان"	مدیر: الیاس خاں (سالانہ)	۵۰ روپے
ماہ نامہ "دینی صحافت کا جائزہ"	مدیر: سجاول خاں (سالانہ)	۲۰۰ روپے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com